ایک گھریلو معاشرتی ناول

مصنفہ:- فرزانہ نصیر

ناز کتاب گھر شاندار مارکیٹ ٹیامحل دہلی ۶

نام کتاب ــــــــــــ ثمینہ
مصنفّہ ــــــــــــ فرزانہ نصیر وارثی
قیمت ــــــــــــ چھ۶ روپے
طباعت لیتھو ــــــــــــ جمال پریس
ناشر ــــــــــــ محمد انوار۔ محمد عرفان۔ جمشید علی
ناز کتاب گھر

انتساب

اگر آپ راہِ وفا میں ایثار کا حوصلہ رکھتے ہیں
تو...... آپ ہی کے نام........

فرزانہ وارثی

ہماری آئندہ کتب

(۱) پھول مسکرائے ـــــ نیلوفر تیموری

(۲) مونا ـــــ زرینہ ضمیر

(۳) شاخ بریدہ ـــــ حمیدہ جبیں

(۴) وفا ـــــ نذرانہ یاسین

۵

(۱)

ڈاکٹر ذوالفقار علی کا شمار مدراس کے ممتاز ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ وہ یہاں
کے مقامی ہسپتال کے سول سرجن اور دل کے امراض کے ماہر انچارج ڈاکٹر تھے اس
کے علاوہ شہر میں تین چار جگہ پر ان کے ذاتی دواخانے بھی تھے۔ اور قریبی گاؤں
میں وہ غریبوں کے لئے اپنے خرچ پر ایک ہسپتال بنوا رہے تھے۔ ڈاکٹر ذوالفقار
بے حد رحمدل اور انسان دوست آدمی تھے۔ اسی لئے تو اللہ نے ان کے ہاتھوں میں
اس قدر شفا بخشی تھی۔ کہ آج تک ان کا کوئی بھی آپریشن کہیں ناکام نہیں ہوا
تھا۔ وہ ڈاکٹر کیا تھے انسان کے روپ میں خلق خدا کے لئے فرشتہ تھے۔ ان کے
ہنس مکھ ہونے کا یہ عالم تھا۔ کہ مریض ان کی دلپذیر باتوں سے اپنی آدھی تکلیف
بھول جاتے۔ وہ ہر ایک سے کچھ ایسے انداز سے پیش آتے کہ ہر چھوٹا بڑا ان کے
گن گاتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ ہسپتال
کا سارا عملہ اور ان کے خاندان کے لوگ یا ملنے جلنے والے ان سے بعید

متاثر تھے۔

ان کی عمر پنتالیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ لیکن تندرستی اور نیک چلنی نے ان کے بڑھاپے کی آمد کو کئی قدم روک رکھا تھا۔ وہ خاصے خوبرو دکھائی دیتے تھے۔ اور اپنے کئی نوعمر دوستوں یا شاگردوں کے حلقہ میں اپنی مردانہ وجاہت کے لحاظ سے کافی ہردلعزیز تھے۔

آج سے تقریباً بیس سال قبل ان کی شادی ان کی اپنی مرضی اور چاہت سے اپنی خالہ زاد بہن سے ہوئی ——— ان کی محبوب شریک حیات ملیحہ اپنے نام ہی کی طرح پرکشش حسن کی مالک تھی۔ اس کی ملیح صورت جو بھی ایک دفعہ دیکھ لیتا۔ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کے سانولے روپ، سیاہ لانبے بالوں اور جادو بھری نشیلی آنکھوں نے ڈاکٹر ذوالفقار کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ماں باپ کے لاڈلے ہونے کے سبب ضدی بھی بے حد تھے۔ اور ان کی اس ضد نے ان کے والدین کو کشیدگی اور رنجش کی دیوار توڑنے پر مجبور کر دیا۔ جو برسوں سے ان کی والدہ اور خالہ کے درمیان چند وجوہات پر قائم تھی۔ ملیحہ ایک تعلیم یافتہ اور سلیمی ہوئی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی عادات اور نیک خصائل کی وجہ سے جلد ہی دونوں خاندانوں کے درمیان پیدا ہونے والی رنجش کو قطعاً ختم کر ڈالا۔

ذوالفقار اس کی پیاری شکل سے بڑھ کر اس کی دلپذیر عادات پر مرمٹے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کی یہ خوشی ان کو چند سال تک ہی راس آسکی ان کے ہنستے کھیلتے خاندان کو شائد کسی کی نظر لگ گئی۔ کہ ان کی عزیز ترین

متاعِ حیات ان سے لوٹ لی گئی۔ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے ان کی تمناؤں کے پھولتے پھلتے چمن کو اجاڑ دیا۔ سنگدل آسمان کو ان کی مسرت بھری زندگی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور وہ قضا وقدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہ گئے۔ اپنی اتنی پیاری شریکِ زندگی کو اتنے لمبے سفر پر نہ جانے کے لئے مجبور بھی نہ کر سکے۔ اور حیران و ششدر سے دیکھتے رہے۔ جس شخص کو اتنی تمناؤں سے اپنایا تھا۔ اس کو سلا کے لئے اپنے سے جدا کرتے ان کا اپنا دل پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ سات سال کی یہ رفاقت ان کی روح میں لاتعداد زخم چھوڑتی ہوئی ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ زندگی کے سفر میں یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔ اگر انہیں اپنی محبت کی نشانی دو سالہ ثمینہ کا خیال نہ ہوتا۔ یا وہ اس جہان میں نہ آئی ہوتی۔ تو وہ یقیناً خودکشی کر چکے ہوتے ——— لیکن ان کے اس ارادہ میں بار بار ثمینہ کی معصوم ہستی حائل ہو جاتی۔ اور وہ دروازہ کھول کر پھر بند کر دیتے۔ جن میں ان کا بھرا ہوا پستول موجود تھا۔

ان کے والدین تو ثمینہ کی پیدائش سے تین سال قبل ملکِ عدم کو روانہ ہو چکے تھے۔ ایک چھوٹی بہن ہی تھی جو ان سے دور تھی۔ اور اس موقعہ پر لندن میں اپنے شوہر و بچوں کے ساتھ مقیم تھی ——— آخر وہ ثمینہ کو کس کے سپرد کر کے جاتے؟۔

چنانچہ وہ بڑی بے دلی سے زندہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن یہ خیال کہ ملیحہ اکیلی منوں خاک کے نیچے ہمیشہ کی نیند سو رہی ہے۔ ان کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنے بیڈ روم سے باہر نہ نکل سکے۔ یہاں تک کہ

اگر کوئی ان کی مرحومہ بیوی کا افسوس کرنے بھی آتا۔ تو ان کے گھر کا پرانا ملازم جسے اب خاندان کا فرد ہی تصور کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں سے ملتا۔ ان کے دوستوں نے ان کو بہلانے کے لئے کئی طریقے استعمال کر ڈالے۔ لیکن وہ تھے کہ جانے والی کے غم میں خود کو ہلکان کئے دے رہے تھے۔

جن عزیزوں یا دوستوں نے ان کو دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا وہ ان کی صورت سے متنفر ہو گئے۔ یہاں تک کہ پھر کسی نے ایسی بات کہنے کی جرأت نہ کی۔

غرض یوں ہی دن ہفتوں اور ہفتے ماہ و سال میں تبدیل ہوتے گئے۔ ذوالفقار کے دل پر قدرت نے جو گہرا زخم بنا دیا تھا۔ اس کو ملیحہ کی دائمی جدائی نے اچھا تو نہ ہونے دیا لیکن ثمینہ کی ذات نے انہیں مجبور کر دیا۔ کہ وہ اس کی خاطر اس دنیا میں کچھ دلچسپی لیں۔

اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھ سکیں۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے خود کو خدمت خلق میں کھو دیا۔ ان کی بیشمار جائداد اس بات کی کفیل تھی۔ کہ وہ ثمینہ کی اعلیٰ تعلیم اور اس کی امیرانہ زندگی گذارنے کے علاوہ ان کے اس نیک مقصد کو پورا کر سکے۔ اس بلند نظریئے کے تحت انہوں نے چند شفا خانے بنوائے اور مستقبل قریب میں غرباء کے لئے ان کے آبائی گاؤں میں ایک شاندار ہسپتال کا قیام ہونے والا تھا۔

ان کی بیٹی ثمینہ اب سترہ اٹھارہ برس کی حسین دوشیزہ تھی۔ وہ اپنی ماں مرحومہ کی مکمل شبیہ تھی۔ وہی موہنی صورت۔ بال تک کا فرق

نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب جب اسے اپنے سامنے پاتے تو ان کے دل کا درد کچھ اور بھی بڑھ جاتا۔ ملیحہ جیسے دوبارہ زندہ ہو چکی تھی۔ وہ بیٹی پر دل و جان سے فدا تھے۔ اور اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ ثمینہ نے بھی ہوش سنبھالتے ہی باپ ہی کو گھر میں پایا۔ اس لئے وہ بھی باپ کے سائے تک کو پیار کرتی تھی۔

ماں ــــــ؟ ماں کیسی ہوتی ہے ؟ کاش میری ماں بھی زندہ ہوتی!
وہ اکثر ماں کے متعلق سوچا کرتی ــــــ ماں کی ذات سے محرومی اس کے لئے ایک امٹ روگ بن گئی تھی۔ بچپن میں اسکول کی لڑکیاں جب اپنی ماں کا ذکر کرتیں تو وہ اداس ہو جاتی۔ اس کا ننھا سا ذہن ہر وقت اس تین حرفی لفظ " ماں " کے متعلق سوچ سوچ کر تھک جاتا ــــــ اسے اب بھی یاد تھا کہ ایک دفعہ اس کے اسکول کی ایک تقریب میں سب بچوں کی ماؤں کو مدعو کیا گیا۔ کلاس میں دعوت نامے ہر بچے کو دیئے گئے۔ استانی نے اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی دعوت نامہ تھما دیا۔ وہ اپنی مس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ اور ایک نگاہ حسرت اس پر ڈال کر رہ گئی۔ استانی نے اس کے انداز کو محسوس کیا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہ گئی۔

جب چھٹی ہوئی تو ڈاکٹر ذوالفقار حسب معمول آج بھی ہسپتال سے واپسی پر اسے لینے اسکول آئے۔ ثمینہ چپ چاپ سی گیٹ کے پاس کھڑی

تھی۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح "ہلو ڈیڈی" کہتی ہوئی ان کی طرف بھاگ بھی نہ سکی۔ بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی خاموشی سے ان کے قریب کار کی اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر صاحب حیران تھے۔ کہ آج ان کی بیٹی چپ کیوں ہے؟۔ وہ پریشان سے ہو گئے۔ آخر نہ رہ سکے اور اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے بیٹی؟ کیا مس نے کچھ کہا ہے؟"

اس پر اس نے اپنا خوبصورت بالوں سے ڈھنپا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔

"تو پھر میرا بیٹا اداس کیوں ہے؟"

وہ ویسے ہی سٹیرنگ پر جھکے ہوئے اس کے پیازی گال تھپتھپا کر بولے اپنی سات سالہ معصوم بچی کی یہ اداسی انہیں ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔

"یہ آج مجھے مس نے دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی اپنی امی کو دینا۔ اور بچوں کو بھی ملے ہیں۔ ان سب کی امی تو آئیں گی۔ لیکن . . . ."

اس کی آواز یہ کہتے کہتے بھر آگئی اور وہ رونے لگی۔

اس کے منہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر ڈاکٹر ذوالفقار کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ اور ان کے ہاتھ میں پکڑا دعوت نامہ لرزنے لگا۔ وہ بمشکل کار پر قابو رکھ سکے۔ ورنہ وہ سامنے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا جاتی۔

"ابو! میری امی کہاں ہیں؟ کبھی ہمارے گھر آتی نہیں کیا ہم سے ناراض ہیں۔؟" ننھی ثمینہ باپ کے جذبات سے بے خبر اس کے دل و دماغ پر پے در پے ان سوالات سے وار کر رہی تھی۔

"ابو جان! آپ بولتے کیوں نہیں؟" وہ بڑے معصوم انداز میں اپنے ننھے ہاتھوں سے باپ کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی! وہ ہم سے روٹھ کر چلی گئی ہیں ۔۔۔ بڑی بے رحم ہیں، تمہاری ماں ۔" ذوالفقار آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بچی کی تسلی کے لئے بولے۔

"اگر وہ آپ سے ناراض ہیں تو مجھے بتا دیئے میں ان کے پاس چلی جاؤں گی .... میں ...."

"ایسا نہ کہو بیٹی!" انہوں نے تڑپ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

" ایسے کیوں کہتے ہیں آپ ابو جی! کیا امی کوئی گندی جگہ گئی ہیں۔؟" وہ حیران سی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے باپ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"نہیں تو بیٹے! وہ تو بہت خوبصورت مقام پہ ہیں۔ لیکن ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ کسی دن میں وہاں خود جا کر انہیں بلاؤں گا ــــــ آواز دوں گا۔ وہ ضرور آئیں گی۔ ہاں ضرور!"

شدت جذبات سے ان کا گلا رندھ گیا۔ اور ان کی آنکھوں سے

آنسو بہہ نکلے۔ ثمینہ یہ دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

"ابو! آپ کیوں رو تے ہیں؟ آپ امی کو کسی دن بلا لیں۔ کل تو میں آپا جان کو لے جاؤں گی ــــ وہ بھی تو مجھے اتنا ہی پیار کرتی ہیں۔ میری سہیلی کہتی تھی۔ کہ اس کی امی اس کو اتنا ہی پیار کرتی ہیں۔ جیسے آپا جی مجھے کرتی ہیں۔ ہیں نا ابو؟" ثمینہ باپ کو پریشان دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور انہیں تسلی دے رہی تھی۔

ہاں بیٹے! ڈاکٹر ذوالفقار رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے بولے۔

غرض جب تک ثمینہ چھوٹی تھی۔ وہ اکثر انہیں ایسے ہی سوالات کر کے اپنی ماں کے لئے ضد کیا کرتی تھی۔ لیکن سن شعور تک پہونچتے پہونچتے وہ سب حالات سے آگاہ ہو چکی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اپنے ابو کے دکھ بانٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ــــــ وہ یہی کوشش کرتی کہ اس کا باپ دکھی نہ ہو۔ لیکن اس کو کیا خبر تھی کہ عزیز شریک حیات کی جدائی اس کے والد کو کس منزل کی طرف لے جا رہی ہے۔؟

شاید وہی منزل جو ہر انسان کا انتظار کرتی ہے۔ جہاں پہنچ کر ہر انسان ہمیشہ کے لئے سکھ کا سانس لیتا ہے۔ جہاں پر اس کو ابدی سکون میسر آتا ہے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

(۲)

شمیمہ مدراس کے کینرڈ کالج میں بی اے سال اول کی طالبہ تھی۔ اور اپنے کالج میں خاصی ذہین مشہور تھی ——— پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسے کھیلنے اور ڈراموں میں حصہ لینے کا بے حد شوق تھا۔ کالج کا کوئی ایسی تقریب نہ تھی۔ جس میں شمیمہ کا نام شامل نہ ہو۔ وہ پروفیسروں کی نظر میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس پر مرتی تھیں۔ خدا نے جہاں اس کو اتنی پیاری صورت دی تھی۔ وہاں اسے موسیقیت سے بھرپور آواز بھی عنایت فرمائی تھی۔ اس کے گلے میں غضب کا سوز تھا۔ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں جب وہ اپنی غزل ترنم کے ساتھ پڑھتی تو سامعین جھوم جھوم جاتے بعض پر تو رقت سی طاری ہو جاتی۔ ڈاکٹر ذوالفقار نے بیٹی کے اس شوق اور قدرتی عطیہ کو محسوس کرتے ہوئے اسے فن موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے ایک استاد مقرر کر رکھا تھا۔ جب وہ کالج سے واپس آتی تو ماسٹر سے ستار

اور دوسرے ساز بجانا سیکھتی۔

وہ بچپن ہی سے کچھ خاموش طبع اور تنہائی پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت یا تو مطالعہ میں صرف ہوتا۔ یا وہ اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف رہتی۔

اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے باغ کے کسی تنہا گوشہ میں گھنے درختوں کی چھاؤں تلے ستار کے تاروں سے درد بھرے نغمے پیدا کرنا اور ان کے سوز و گداز میں ڈوب ڈوب کر ایک انوکھی دنیا میں پہونچ جانا۔ اس کی سہیلیاں کبھی اس سے ملنے آتیں یا اس کی سالگرہ ہوتی۔ تو اس کی تنہائیاں پریشان ہو جاتیں۔ اس کے ابو کتنی دھوم دھام سے ہر سال اس کی سالگرہ مناتے اس موقع پر ان کے دوست اور خاندان کے کچھ لوگ یا اس کی سہیلیاں مدعو ہوتیں۔ اور پھر جب یہ ہنگامے خاموش ہو جاتے۔ تو پھر وہ اپنی تنہا زندگی میں لوٹ آتی اور جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ اس کی ان سوچوں سے بوڑھی آیا بھی بہت عاجز تھی۔ اس کی جہاندیدہ نظریں اس کی اس خاموش زندگی کے پس پردہ کچھ اور تلاش کرتیں۔ اگرچہ وہ کوشش کے باوجود بھی کچھ نہ جان سکی۔ لیکن برابر اسی کھوج میں تھی۔ اور ایک دن جب کہ ثمینہ اپنے کمرہ کی کھڑکی سے لگی ہوئی بادلوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ آیا اس کے کمرہ کی صفائی میں مصروف تھی۔ اور بات چھیڑنے کی غرض سے الفاظ ڈھونڈھ رہی تھی۔ آخر اس نے اسے مخاطب کر ہی لیا۔ اور گلدان میں گلاب کے پھول سجاتے ہوئے بولی:

بیٹی، ثمینہ ! ایک بات پوچھوں ؟

"کیا بات ہے ؟ آپا اماں ؟ ثمینہ اس کے انداز پر قدرے حیران ہو کر کہنے لگی۔

" اے بٹیا ! میں تیرے واری جاؤں۔ تو ہر وقت اداس کیوں رہتی ہے۔؟ میں تیری ماں کے برابر ہوں۔ مجھ سے نہ چھپا بیٹی ! کہیں یوں سوچ سوچ کر خود کو نصیب دشمناں بیمار نہ کر لینا ۔ اتنے دنوں سے تجھے دیکھ رہی ہوں کہ تو چپ سی ہے ۔،، آپا نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے بڑے تفکر آمیز انداز میں پوچھا۔

" حد ہو گئی آپا ماں ! بس اتنی سی بات پر آپ یوں پریشان سی ہیں ۔"

ثمینہ اس کی پریشانی پر بے ساختہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی ۔

" تو اور کیا بیٹی ! تو نے تو واقعی مجھے فکر میں ڈال دیا۔ نہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے۔ کالج سے آکر پڑھائی یا استاد صاحب سے ستار سیکھنا اور تجھے دنیا کا ہوش ہی نہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہتی ہوں کہ ہو چکی پڑھائی وڑائی۔ اب خیر سے بٹیا رانی سیانی ہو گئی ہے ۔اس کے لئے کچھ سوچیں۔ آپا نے اپنی بوڑھی آنکھوں میں ممتا کا سارا پیار سمیٹ کر پیار سے ثمینہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن ———— ثمینہ اس کے آخری فقرہ پر لجا کر اس کے پاس سے ہٹ آئی ۔

"لیجئے ! ماں ! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں ارے ! کہیں ایسا غضب کبھی نہ کیجئے گا کہ ابا جان کو ایسی بات یاد دلا دیں ۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا خیال کریں

گئے۔"

"کمال کرتی ہو بیٹیا! یعنی میں انہیں یاد کراؤں۔ انہیں تمہارے خیال میں اس بات کا دھیان نہیں ہوگا۔ وہ باپ ہے اس نے تیرے لئے بہت کچھ سوچ رکھا ہوگا۔" آیا کہہ رہی تھی۔

"نہیں آیا ماں! مجھے ابھی بہت سا پڑھنا ہے۔ ولائت جانا ہے اور اس کے بعد مجھے اپنے وطن کی خدمت کرنا ہے۔ جیسے ابا حضور کہہ کر رہے ہیں۔ میں تو اس سے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی آیا اماں۔" ثمینہ نے بڑے پر تقدس انداز میں کہا۔ اس کی روح کی تمام پاکیزگی اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس لمحہ اس کی آنکھیں یوں نظر آرہی تھیں جیسے جھیل میں دو شمعیں فروزاں ہوں۔

آیا اس کے انداز پر قدرے مرعوب سی ہو کر رہ گئی۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

پھر بھی بیٹی! تم جتنا بھی پڑھ لو آخر کو تو پرائے گھر جانا ہے۔ آج تک تو یہی سنتے آئے ہیں کہ بادشاہ کی بیٹی بھی پرائی ہو کر رہتی ہے۔" آیا بڑے روایتی انداز میں بولی۔

یہ سب گذرے زمانہ کی باتیں ہیں آیا ماں! آج کا انسان بہت ترقی کر چکا ہے۔ اور اس ترقی پسند دور میں ان باتوں کو زیادہ تر محسوس نہیں کیا جاتا اور پھر ہمارے ملک کو ایسی ہستیوں کی ضرورت ہے جو اپنی خواہشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قوم کے کچھ کام آئیں۔

وہ چاہے مرد ہو یا عورت ۔ وقت نے ہر تمیز مٹا دی ہے اس دور کو ایسے معماروں کی اشد ضرورت ہے ۔ جو بنی نوع انسان کو اس کے تیز دھاروں میں اندھا دھند بہہ جانے سے بچا سکیں اور انہیں اس بات کی تعلیم ملنی چاہیئے کہ وہ وقت کی پکار پر لبیک کہہ سکیں ۔ لیکن تیز رفتاری کی جھپٹ میں نہ آنے پائیں ۔ ثمینہ نے آپا کی کم علمی کا احساس کیئے بغیر اس کے سامنے ایک اچھا خاصہ لیکچر جھاڑ دیا ۔

خیر بیٹی ! رانی بیٹیا ! تم کیا کہہ رہی ہو ۔ میرے پلے تو خاک نہیں پڑا ۔ پھر بھی میں تو یہی کہوں گی ۔ کہ بیٹی سدا ماں باپ کے پاس نہیں بیٹھی رہتی ۔ پرایا دھن ہے پرائی ہو کر رہتی ہے ۔ آپا نے ثمینہ کی باتوں کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے پھر وہیں تان توڑتے ہوئے کہا ۔

ہائے آپا ماں ! آپ سمجھتی کیوں نہیں ! کیوں تنگ کرتی ہیں ۔ ثمینہ لاڈ سے آپا کی باہوں میں جھولتے ہوئے ٹھنک کر بولی ۔

آج ہی ڈاکٹر صاحب سے کہتی ہوں کہ جلد ہی ثمینہ بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں ۔ آپا ثمینہ کو چھیڑتے ہوئے بولی اور کمرہ سے باہر جانے لگی ۔

آپ کو میری جان کی قسم ہے آپا ماں ! آپ ابا جان سے ایسی کوئی بات کریں تو ـــــ ثمینہ اس کے پیچھے لپکتے ہوئے بولی ۔

اچھا بابا ! میں ان سے کچھ نہیں کہتی ـــــ تو جا کر آرام کر ۔ آپا نے اس کے بالوں کی پیشانی پر جھولتی ہوئی لٹ کو پرے ہٹاتے ہوئے پچکار کر کہا ۔

اس پر شمیلہ کمرہ میں واپس آکر بستر پہ دراز ہو گئی۔ اور آپا کی باتوں پہ غور کرنے لگی۔

---

(۳)

ڈاکٹر ذوالفقار کا معمول تھا کہ وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر اپنے شفاخانوں کا راؤنڈ بھی لیتے اور وہاں پر مامور کردہ ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کے کام کا معائنہ کرتے انہیں چند ضروری ہدایات دیتے اور کبھی خود بھی مریضوں کی دیکھ بھال کرتے کبھی کبھی چند گھنٹوں کے لئے گاؤں چلے جاتے اور وہاں زیر تعمیر ہسپتال کے کام کو دیکھتے اور واپس آجاتے ۔ یہ سب کام کر کے انہیں ایک گونہ خوشی ہوتی ۔ ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ۔ اور پھر گھر واپس آجاتے ۔ جہاں ان کی محبت کا پھول تہمینہ ان کا خیر مقدم کرتی ۔ دونوں باپ بیٹی گھنٹوں مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے ۔ وہ باپ اور بیٹی کے رشتے سے ہٹ کر دو دوست تھے ۔ کبھی کبھار دونوں کوئی فلم دیکھنے چلے جاتے ۔ ڈاکٹر ذوالفقار نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری کا ماہر بھی کر دیا تھا ۔ وہ دونوں اکثر صبح سویرے میلوں گھوڑ سواری کرتے ۔

ڈاکٹر صاحب اپنی موجودہ زندگی میں کافی سے زیادہ مطمئن تھے ۔ ان کی

بیٹی کیا جوان ہوئی تھی۔ انہیں ایک سچا غمگسار مل گیا تھا۔ ایک ساتھی میسر تھا
غرض تہمینہ باپ کے لئے ایک دوست ثابت ہوئی تھی۔ اس نے آیا سے اپنے
ماں باپ کی محبت کی کہانی اور پھر ماں کی بے وقت موت ـــ باپ کا اس
کے لئے تڑپنا یہ سب باتیں سنی تھیں۔ اسے اپنے باپ کے دکھ کا پورا پورا
احساس تھا ـــ اور اس نے کبھی بھولے سے بھی باپ کے سامنے ماں
کا ذکر نہ کیا تھا۔

" آہ! کتنے دکھی ہیں ابو!" وہ اکثر یہ سوچ کر سرد آہیں بھرتی۔ ماں
کے نہ ہونے سے اسے کچھ کم دکھ نہیں تھا۔ حالانکہ ماں اسے یاد بھی نہ تھی لیکن
پھر بھی وہ ماں کی مقدس محبت کے لئے تڑپ اٹھتی۔ اور اس کا دل بے
ساختہ ماں کی شفقت بھری گود میں سر رکھنے کو ترستا۔ اور اس موقعہ پر وہ
آیا سے لپٹ جاتی۔ جس نے اسے واقعی ماں کی طرح پالا تھا۔ اور وہ بھی اسے
اسی لئے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی۔

ایک دن ذوالفقار علی ہسپتال سے واپس آئے تو ان کے ذاتی ملازم نے
انہیں روزانہ کی طرح آج بھی ڈاک دکھائی ـــ وہ خطوں میں اپنی چھوٹی
بہن کا خط دیکھ کر اسے کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ خط پڑھ کر وہ قدرے
مسرور نظر آ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بہن کے اتنے سالوں بعد آنے پر خوش
ہو رہے تھے۔ اس مدت میں صرف خط و کتابت کے ذریعہ احوال پرسی ہو
جاتی تھی۔ اور آج کے خط میں ان کی بہن نے اپنے اور اپنے شوہر اور بچوں کے
ہمراہ موسم گرما میں آنے کے لئے لکھا تھا۔

انہوں نے ملازمہ سے کہا کہ وہ ثمینہ کو بلا لے۔ اور ثمینہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔

"ابو حضور آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔" ثمینہ نے اپنے باپ کے چہرے پر مسرت آگیں تاثر محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹی! ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو اور یہ خط پڑھو۔ تمہاری پھوپھی جان نے لکھا ہے۔"

ذوالفقار بیٹی کو قریب بٹھاتے ہوئے بڑے شفقت آمیز انداز میں بولے۔

ثمینہ ان کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنے لگی۔ جسے پڑھ کر باپ کی طرح وہ بھی بے حد خوش ہوئی۔ تصویر کے علاوہ آج تک اسے اپنے ابو کی پیاری بہن کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن عنقریب ہی وہاں سے ملنے والا تھا۔

"کتنی اچھی بات ہے ابو جان۔"

ثمینہ خط بند کرتے ہوئے وفور مسرت سے بس اتنا ہی کہہ کر رہ گئی۔

دیر تک دونوں باپ بیٹی اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ملازم نے شام کی چائے تیار ہونے کی اطلاع کی تو ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔

(۴)

ناشتہ سے فارغ ہوکر ثمینہ کورس کی کتابیں لئے باہر باغ میں چلی آئی ۔
ذوالفقار علی اس وقت اپنی لائبریری میں مصروف مطالعہ تھے
ثمینہ کے کالج میں آج کل موسم بہار کی چھٹیاں تھیں ۔ وہ زیادہ وقت
باغ میں بیٹھ کر پڑھنے میں صرف کرتی ۔
اس نے کتابیں آڑو کے گھنیرے درخت کے نیچے بچھے بنچ پر رکھیں
اور خود چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گلاب کی جھاڑیوں کے پاس چلی آئی ۔
گلاب کے مختلف رنگوں کے پھول کانٹے دار ٹہنیوں پر مہک رہے
تھے ۔ ان کی پتیوں پر شبنم کے پاکیزہ قطرے آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے
تھے ۔ پھول اتنی بہتات میں تھے ۔ کہ دور سے دیکھنے پر مختلف رنگوں کے
ڈھیر معلوم ہوتے تھے ۔
چمن میں اس وقت بہار کے حسین رنگیں ذرے ذرے پر برس رہے

تھے ۔ وسیع لان کے کناروں پر آلو چے اور آلوبخارا کے درخت سفید اور پیازی پھولوں سے لدے کھڑے تھے ۔ پھولوں سے لدی کچھ لمبی لمبی شاخیں لان کے وسط میں بنے شفاف پانی کے تالاب میں جھک گئیں تھیں. گویا پانی میں اپنا حسین عکس دیکھ کر خود ہی اپنے حسن کی داد دے رہی ہوں. فضا میں ہر طرف ان پھولوں کی بھینی بھینی سی خوشبو رچی ہوئی تھی ۔ ان درختوں کے نیچے گھاس اور پتوں پر جا بجا پھولوں کا فرش بچھا تھا ۔ جن پر اوس کے موتی بکھرے پڑے تھے ۔

باغ میں ایک طرف سنگ مرمر کا چبوترہ بنا دیا گیا تھا. جس کی وضع مور کی سی تھی ۔ اس کی جسامت اس قدر تھی کہ اس مور کی پشت پر دو یا تین آدمی بآسانی بیٹھ سکتے تھے ۔ اسے اس انداز سے بنایا گیا تھا. کہ مور کی پشت پر چڑھنے کے لئے سیڑھیوں کا کام مور کے پروں سے لیا گیا تھا. جن پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھا جا سکتا تھا. اس کے حسن میں جو چیز اضافہ کر رہی تھی. وہ پانی کے مسلسل ٹپکتے ہوئے قطرات تھے ۔ جو مور کی آنکھوں سے نکل کر نیچے بنے خوبصورت سے حوض میں گر کر جلترنگ سا بجا رہے تھے ۔ پانی میں چمیلی کے پھول تیرتے رہتے. چمیلی کے پھولوں سے لدی بیلیں پتلی پتلی تاروں کے ذریعہ مور کی گردن سے باندھ دیئے گئے تھے ۔ اور یہ پھول ہر وقت ان ہی بیلوں گرتے رہتے. ثمینہ کو باغ کا یہ حصہ اس لئے بہت پسند تھا ۔ اور وہ اکثر اسی چبوترے پر بیٹھا کرتی تھی ۔ چاندنی راتوں میں تو یہاں نشست کا لطف دو چند بڑھ جاتا ۔

اس کے علاوہ موسمی انگریزی پھولوں سے ڈھنپے ہوئے خوش رنگ قطعات روشوں کے ساتھ ساتھ ایک عجیب نظارہ پیدا کر رہے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرو کے مخروطی درخت نیم دائرہ بناتے ہوئے گیٹ کی طرف ختم ہو جاتے تھے۔ آج کل تو ان پر نیا جوبن آیا ہوا تھا بلبلیں ان پر ہزار جان سے فدا ہو رہی تھیں۔

ثمینہ جتنی دیر باغ میں ٹہلتی رہی۔ بہار کی اس عنایت اور قدرت کی صناعی کی دل کھول کر تعریف کرتی رہی۔

وہ پڑھنے کے خیال سے اس بنچ کی طرف بڑھی ہی تھی۔ جس پر وہ اپنی کتابیں رکھ کر آئی تھی کہ عقب سے نقرئی ہنسی کی آواز پر چونک سی گئی اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی عزیز سہیلیاں عندلیب اور سعدیہ کچھ فاصلے پر کھڑی اس کی باغ کے حسن پر اتنی محویت دیکھ رہی تھیں۔ وہ دیر سے سرو کے ایک درخت کے پیچھے محو تماشہ تھیں۔

"ارے! تم کب آئیں؟"

ثمینہ نے قدرے جھینپ کر پوچھا۔

"دیر سے حضور کو گلگشت کرتے دیکھ رہی تھیں۔ مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اور فارغ ہونے کے انتظار میں یہاں چھپی کھڑی رہیں۔"

عندلیب نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے چھیڑا۔

"حسن قدرت کی تعریف کر رہی تھی۔" ثمینہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"اگر قدرت کے حسن کی تعریف کرنا ہو، تو خود کو آئینہ میں دیکھ لیا کرو۔"

سعدیہ نے لقمہ دیا۔ جس پر شمینہ کا گندمی رنگ پیازی ہوگیا۔

"خوش فہمی میں مبتلا کرنے والی باتیں جانے دو۔"

شمینہ نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ مسکرانے سے اس کے خوبصورت سفید دانت گلابی ہونٹوں کے درمیان یوں دکھائی دینے لگے جیسے گلاب کی ادھ کھلی کلی میں سے شبنم کے آبدار موتی جھانک رہے ہوں۔

"تو اب ہمیں حسن قدرت کی تعریف کرنے سے کیوں منع کرتی ہو۔"

عندلیب نے پیار سے اس کی سیاہ دراز چوٹی سے کھیلتے ہوئے اسی کے الفاظ دہرا دیئے۔

"بہت بری ہو تم لوگ!" شمینہ نے شاکی انداز میں دونوں کی طرف دیکھا۔

"ارے! وہ کیوں؟"

دونوں یک زبان ہو کر بولیں۔

"جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں آج پہلی مرتبہ شکل دکھائی ہے، تم دونوں نے۔"

شمینہ برابر اسی انداز میں بولی۔

"تم تو جیسے روز ہی آجایا کرتی تھیں۔"

عندلیب نے بھی شکایت کی ۔

"فون تو دن میں بیس بار کرتی تھی نا ۔" لیکن جواب ملتا کہ گھر میں نہیں "

آخر کہاں تھیں تم لوگ ۔" ثمینہ نے مصنوعی خفگی سے کہا ۔

"خرید و فروخت نے ہی ہوش و حواس ختم کیے ہوئے ہیں ۔" اور تم

پوچھتی ہو کہ " کہاں تھیں تم لوگ ! "

عندلیب نے بھی اسی انداز میں جواب دیا ۔

" اوہ ، اچھا ! لیکن ان محترمہ کو کیا مصروفیت تھی ؟

ثمینہ نے کچھ سمجھ کر عندلیب کی بات کا جواب دیتے ہوئے سعدیہ

کے متعلق پوچھا ۔

" اونہہ ! یہ تمہاری طرح تو نہیں کہ اتنی عزیز سہیلی کی شادی ہے

اور محترمہ کو کتابوں کے علاوہ کسی کا ہوش ہی نہیں ۔ "

" اچھا تو تم بھی عندلیب کے ساتھ خرید و فروخت میں مصروف

تھیں ۔

ثمینہ نے قدرے حیرت سے پوچھا ۔

" جی ! "

سعدیہ نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں جواب دیا کہ وہ دونوں ہنسنے

لگیں ۔

" واہ بھئی ! تم نے مجھ سے کبھی تو کہا ہوتا تاکہ میں بھی تمہاری کچھ

مدد کرتی ۔ "

ثمینہ نے عندلیب کو مخاطب کیا۔

" تمھی کہیں کی۔ ایسی باتیں بھی کہیں پوچھی جاتی ہیں۔ تمہیں خود تو احساس نہیں تھا۔؟ "

عندلیب نے گلہ کیا۔

" اچھا بھئی! آئندہ خیال رکھوں گی۔ "

ثمینہ نے ہنستے ہوئے عندلیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:

" کیا مطلب؟ آئندہ؟ "

عندلیب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" آئندہ سے مراد یہ ہے کہ جب اپنی سعدیہ کی باری آئے گی تو یہ کسی کو ہاتھ نہ لگانے دوں گی۔ "

ثمینہ نے اس کی حیرت مٹاتے ہوئے سعدیہ کو چھیڑا۔

" اللہ کے واسطے عندلیب اسے چپ کراؤ۔

سعدیہ نے عندلیب کی منت کرتے ہوئے ثمینہ کے ایک ایسی چٹکی لی کہ وہ بے چاری اچھل پڑی۔

" بھئی تم دونوں خوب جھگڑو۔ میں تو تھک گئی ہوں۔ اب بیٹھنا چاہتی ہوں۔ "

عندلیب انھیں پیچھے چھوڑ کر خود آڑو کے پیڑ کے نیچے بچھے بنچ کی طرف بڑھی۔

"تو چلو ڈرائنگ روم میں یا میرے کمرے میں!" شفیقہ اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے ان سے مخاطب ہوگئی۔

"نہیں بھئی! اتنی پیاری جگہ چھوڑ کر اندر جانا سراسر بدذوقی ہے" عندلیب نے اپنے گرد و پیش پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ پھر قریبی گلاب کی جھاڑی سے ایک پھول توڑتے ہوئے جواب دیا اور کچھ گنگنانے لگی۔

"جی میں آتا ہے یہیں مرجایئے؟"

اتنے میں آپا جی اس طرف آنکلیں۔ دونوں نے انہیں سلام کیا انہوں نے دعائیں دیتے ہوئے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر ان کے پاس ٹھہریں اور پھر جانے لگیں تو شہینہ نے ان سے کہا کہ وہ کسی ملازم کو چائے اور پھل لانے کے لئے کہیں۔ آپا ماں چلی گئیں تو تینوں خوبصورت اور ہم عمر لڑکیاں باتوں میں مشغول ہوگئیں۔

"ثمینہ! تمہیں چند روز کے لئے میرے ہاں چل کر رہنا ہوگا۔"
عندلیب نے ثمینہ کی چینی جیسی سڈول گردن میں اپنے بازو حمائل کرتے اور پیار سے اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔
"میں شادی سے ایک دن پہلے آجاؤں گی۔ اتنے دن ابا جان کو اکیلے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"
ثمینہ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
"چلی چلو نا ثمینہ! دیکھو بے چاری عندلیب ہمارے پاس چند روز کی تو مہمان ہے۔" شادی کے فوراً بعد ہی تو اسے لندن چلے جانا ہے۔"
سعدیہ نے ثمینہ کو مناتے ہوئے افسوس سے کہا۔ تو اس پر

عندلیب کی بھوری بھوری سی پیاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔
ثمینہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر قدرے بے چین ہوکر کہا۔
"ہٹو! ہم نہیں بولتے تم سے۔" ہماری عندلیب کو رلا دیا ہے۔"
سعدیہ اسے مصنوعی خفگی سے پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔ لیکن ثمینہ نے عندلیب کو کچھ اور بھی خود سے لپٹا لیا۔
"بس اب چپ ہو جاؤ اور اگر ایک آنسو بھی گرایا۔ تو میں کبھی نہ بولوں گی۔"
ثمینہ نے اس کی آنکھوں سے اپنے دوپٹہ کے آنچل میں آنسو جذب کرتے ہوئے کہا۔
"اس کو کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"
سعدیہ نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا بھئی چلیں گے! چلیں گے! بس! اب تو خوش ہو جاؤ۔"
ثمینہ نے عندلیب کو مناتے ہوئے کہا۔
"بہت سنگدل ہو تم ثمینہ کی بچی!"
عندلیب نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن اباجان سے اجازت لینا پڑے گی۔" ثمینہ نے کہا۔

"تو کیا وہ تمہیں میرے ہاں جانے سے منع کر دیں گے؟" عندلیب نے پوچھا۔

"نہیں تو! لیکن اس کے علاوہ میرا فرض تو یہی ہے۔ کہ میں ان سے پوچھ لوں۔

ثمینہ نے بڑے سعادت مندانہ انداز میں جواب دیا۔

"اچھا بھئی پوچھ لینا! ابھی تو ہم یہی شکر ادا کرتے ہیں کہ "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔"

سعدیہ نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

"کہاں ہیں چچا جان؟

عندلیب نے ثمینہ سے اس کے والد کے متعلق پوچھا۔

"شائد لائبریری میں ہوں گے۔

ثمینہ نے جواب دیا۔

"تو پوچھ لو نا پھر تیاری کر لو جانے کی۔"

سعدیہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے تہمینہ سے کہا۔

ٹھہر جاؤ جلدی کاہے کی ہے۔ سارا دن پڑا ہے ابھی تو۔" ثمینہ نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

لیعنی سارا دن سے تمہاری کیا مراد ہے۔" دن کے گیارہ بجنے والے ہیں۔"

عندلیب نے رسٹ واچ پہ نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ابھی یہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ذوالفقار علی ثمینہ کو آوازیں دیتے ہوئے ادھر آنکلے۔ وہ عندلیب اور سعدیہ کی آمد سے بالکل لاعلم تھے۔

"جی ابو حضور؟"

ثمینہ نے اپنے باپ کو اس طرف اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے کے لئے جواب دیا۔

اور چند ہی ثانیے بعد ذوالفقار علی ان کے سامنے تھے۔

سعدیہ اور عندلیب نے اپنی اپنی نشست سے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی! ارے! تم لوگ کب آئیں؟ ہمیں تو بتایا ہوتا بیٹی ثمینہ!"

ذوالفقار علی نے باری باری دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ثمینہ کو مخاطب کیا۔

"ہم آپ کے پاس ہی آنے کو تھے ابو!" ثمینہ نے جواب دیا

"آپ سے ایک بات پوچھنی ہے چچا حضور۔

سعدیہ نے ذوالفقار علی کو مخاطب کیا۔

"ضرور! ضرور! بیٹی۔"

ذوالفقار علی نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"پہلے آپ یہ قبول کیجئے اور وعدہ کریں کہ آپ ضرور آئیں گے۔

سعدیہ نے ان کی طرف دعوت نامہ بڑھاتے ہوئے کہا ۔
" واہ بیٹی ! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے ۔" ہم نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا ۔
وہ دعوت نامہ کی تحریر پر نگاہ جماتے ہوئے بولے ۔
عندلیب کا سر دونوں جیسے جھک گیا تھا۔ اور یہ بات سب نے محسوس کی تھی ۔
" اچھا بیٹی ! خدا تمہیں یہ خوشی مبارک کرے انہوں نے عندلیب کے جھکے ہوئے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ تو وہ شرم سے اور بھی سرخ ہو گئی ۔
" چچا جان ! آپ وعدہ کریں کہ آپ ہماری التجا پوری کریںگے
سعدیہ حرف مدعا زبان پر لاتی ہوئی بولی ۔
" ضرور ! بیٹی ، کہو ! "
ذوالفقار علی اسے پر شفقت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے
" ثمینہ کو اجازت دے دیں کہ وہ تین چار روز کے لئے عندلیب کے ہاں چل کر رہے ۔" سعدیہ نے پوچھا ۔
" ہاں بیٹی ! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے ۔" ذوالفقار علی نے اجازت دیتے ہوئے کہا ۔
" شکریہ چچا حضور ! "
سعدیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا ۔ تینوں کے چہرے مسرت سے

اور بھی حسین بنا دیئے تھے ۔

ذوالفقار علی ان کی معصوم خوشی پر مسکرا دیئے: "میں اتنے دنوں تک تمہیں دیکھنے ادھر ہی آجایا کروں گا بیٹی ! "

ذوالفقار علی کو ثمینہ کی اتنے دنوں کی جدائی بھی گوارہ نہ تھی ۔ اس لئے انہوں نے ثمینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔

"چچا جان آپ بخوشی تشریف لائیے گا ۔ "

عندلیب نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ۔ اس کا چہرہ ابھی تک شرم کی سرخی سے لالہ زار بنا ہوا تھا ۔

بیٹی ! یہ میری طرف سے اپنے لئے کوئی تحفہ خرید لینا ۔ دیکھو انکار نہ کرنا ۔ ذوالفقار علی نے اپنے بٹوے سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر عندلیب کے پاس پڑے ہوئے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا ۔

عندلیب ان کی اس شفقت اور سچے دل سے دیئے ہوئے تحفہ کے لئے انکار نہ کر سکی ۔

اور تھوڑی دیر بعد ذوالفقار علی پورچ میں کھڑی کار کی طرف بڑھے ۔ اور پھر ہسپتال جانے کے لئے تیار ہوگئے ۔

ان کے جانے کے بعد تینوں لڑکیاں چمن سے اٹھ کر ثمینہ کے کمرے کی طرف چل دیں ۔

انہیں دیکھ کر ثمینہ کی آپا بھی ادھر ہی آگئی ۔

"آپا ماں! آپ بھی چلنے کی تیاری کریں۔"
شمینہ نے انہیں مخاطب کیا۔
"اے میں صدقے جاؤں! کہاں جانا ہے؟
آپا جی کو جانے کا علم نہیں تھا۔ اس لئے وہ حیران ہوتے ہوئے
بولیں۔
"ان کی شادی خانہ آبادی ہے نا" شمینہ نے عندلیب کو چھیڑتے
ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا۔
"اچھا! سدا سکھی رہو بیٹی! خیر سے کب ہے شادی؟"
آپا جی نے اسے دعائیں دیتے ہوئے پوچھا۔
اس پر عندلیب خاموش رہی شرم جو مانع تھی۔
"ارے آپ بولتی کیوں نہیں!"
شمینہ نے اسے چھیڑا۔!
تیری طرح بے شرم تھوڑے ہوں۔"
عندلیب نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا! تو یہ خیر سے شرم آ رہی ہے محترمہ کو؟"
شمینہ نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے بولی۔
اس پر سعدیہ اور آپا جی ہنسنے لگیں
خدا کے لئے جلدی کپڑے وغیرہ نکالو۔ دیر ہو رہی ہے عندلیب
اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

اور اس پر بوڑھی آیا اس کا وارڈروب کھول کر اس کی مرضی پوچھنے لگی۔ کہ وہ کون کون سے لباس ساتھ لے جائے گی۔

ثمینہ نے دو قیمتی مگر سادہ سی ساڑھیاں اور چار پانچ ہلکے ہلکے رنگوں کے ریشمیں لباس منتخب کئے تھے۔

"زیور کون سا ساتھ رکھوں؟"

"کپڑے نکالنے کے بعد آیا نے اس سے زیور کے متعلق دریافت کیا۔

ثمینہ بہت کم زیور پہنا کرتی تھی۔ کبھی کبھار انگوٹھی یا بالیاں پہن لیتی۔ لیکن اس کے باوجود آیا جی ہمیشہ ذوالفقار علی سے کہہ کر خود اس کے لئے جدید فیشن کے مطابق زیورات بنواتی رہتی تھیں۔ اسی لئے اس کے ڈریسنگ روم کی ایک بڑی سی الماری اعلیٰ سے اعلیٰ زیورات سے مزین تھی۔ اور اس وقت بھی آیا جی کے کہنے پر ثمینہ نے زیور ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔

"دیکھتی ہوں تم کیسے نہیں پہنو گی زیور! آیا ماں دکھایئے میں خود نکالتی ہوں۔" سعدیہ نے پیار سے ثمینہ کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ اور خود ہی زیورات کا انتخاب کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد دو تین ہلکے سے سیٹ منتخب کر لئے۔ اتنے میں آیا جی نے بھی ساتھ چلنے کی تیاری کر لی۔ اور یہ چھوٹا سا قافلہ عندلیب کی خوبصورت

جدید موڈل کی امپالا میں بیٹھ کر اس پرکشش رہائش گاہ کی طرف چل دیا ۔

(۶)

عندلیب کے والد شہر کے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتے تھے
ہندوستان کے کئی ایک شہروں میں ان کے کاروبار کی شاخیں پھیلی
ہوئی تھیں ۔ مدراس ۔ کلکتہ اور بمبئی میں ان کے بزنس کے مراکز تھے
جہاں لوہے کے کارخانے تھے ۔ وہ خالص کاروباری قسم کے انسان

تھے۔ تعلیمی لحاظ سے وہ پڑھے لکھے نہیں کہے جا سکتے تھے۔ کاروبار کو فروغ دینے کے لئے ان کے پاس خداداد ذہانت تھی۔ اور وہ کم علمی کے باوجود اپنا کاروبار خوب چلا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ہر فرم کا ایک علیحدہ منیجر تھا۔ اس لئے اس سلسلے میں انہیں کچھ خاص تردد نہیں تھا۔ وہ صرف ان کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔

وہ لوگوں میں سیٹھ شہاب کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی بیوی ان کے برعکس خاصی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اور اپنے سلجھے ہوئے کردار سے انہوں نے کبھی اپنے شوہر پر اپنی اس برتری کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ آج سیٹھ شہاب اونچی محفلوں میں شرکت کرنے کے قابل تھے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اور اس عمر میں بھی دنیا کے لئے مثال تھے۔ بیگم تنویر شہاب اپنی خوش خلقی اور نیک طبیعت کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں کافی ہر دلعزیز تھیں۔ سیٹھ شہاب اور ان کی بیگم اس قدر روشن خیال اور آزادی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنی حدود کے اندر تھے۔ ان کا میل جول کافی وسیع تھا۔ لیکن انہوں نے آزادی اور روشن خیالی کا غلط فائدہ نہ خود اٹھایا تھا۔ اور نہ اپنی دونوں بچیوں عندلیب اور صدف کو اٹھانے دیا۔ والدین کے خیالات کا اثر ان پر بھی تھا۔

دونوں لڑکیاں خاصی حسین تھیں۔ اور ثمینہ ہی کے کالج میں زیر تعلیم

تھیں۔ عندلیب تو اس کی ہم جماعت تھی۔ اور صدف ایف اے میں پڑھتی تھی۔ والدین نے انہیں دنیاوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی مزین کیا تھا۔ ماں باپ خود بھی روزانہ پانچ وقت کی نماز کے پابند تھے اور دونوں بیٹیوں کو بھی نماز پنجگانہ ادا کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قصر شباب جو واقعی روایتی محلات کا نمونہ تھا۔ اس میں ایک عجیب پرسکون فضا طاری رہتی۔

عندلیب اور صدف ہر محفل کی جان تھیں۔ اونچے گھرانوں کی لڑکیاں ان کی سہیلیاں تھیں۔ آزاد ماحول میں پرورش پانے اور اس کے بعد ہر مزاج کی لڑکیوں سے میل ملاپ نے ان کے اپنے مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ یہ ان کی اپنی فطری نیک چلنی اور والدین کی اعلیٰ تربیت کی وجہ تھی کہ برا ماحول بھی انہیں اپنی فطرت کے منتخب کردہ ڈگر سے نہ ہٹا سکا۔

لوگوں کا یہ نظریہ کہ ماحول کسی کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ ان کے لئے سراسر غلط تھا۔ بلکہ وہ نظریہ قائم کئے ہوئے تھیں۔ کہ خود انسان جس طرح چاہے، خود کو ہر ماحول میں ڈھال سکتا ہے۔

اچھے انسان کے لئے برا ماحول بھی اس کی آزمائش کا سامان پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان ہی کیا جو برائیوں سے اچھائیوں کو اخذ نہ کر سکے۔ ایک اچھے انسان کی مثال تو اس ہیرے کی سی ہے جس کو گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے۔ یعنی برے ماحول میں بھیج دیا جائے۔ تو وہاں اس

ہیرے کی چمک دمک میں اور اضافہ ہوگا ۔ بلکہ اس کی وقعت لوگوں کی نگاہ میں بڑھ جائے گی ——— کسی بھی حالت میں نہ بدلنے والا وجود اس ہیرے کا ہے ۔ یعنی بڑے ماحول میں جاکر انسان اپنی صلاحیتوں کی بدولت سبق ہی حاصل کرے گا ۔ اور ایسا ماحول اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا ۔ سیٹھ شہاب اور ان کا یہ مختصر سا خاندان وقت کے ساتھ ساتھ زمانہ کے کارواں کے ہمراہ تو چل رہے تھے ۔ لیکن انہوں نے اپنی دنیا علیحدہ بسا رکھی تھی ۔ جس میں سکون ہی سکون تھا ۔ ان کے دوست احباب ان کی اس زندگی کو نگاہ رشک سے دیکھتے ۔ ان کی دونوں حسین اور نیک بیٹیوں کے لئے اونچے خاندانوں سے رشتے آنے لگے ۔ آخر بڑی سوچ بچار اور چھان بین کے بعد انہوں نے بڑی بیٹی عندلیب کے لئے ایک معزز خاندان کا لڑکا منتخب کیا ۔

شاہد واقعی عندلیب کے لئے موزوں تھا ۔ وہ حال ہی میں انجینئرنگ پاس کر کے برسرِ روزگار ہوا تھا ۔

دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں اس تقریب کے لئے سیٹھ صاحب نے دو ماہ پہلے سے قصر شہاب کو از سرِ نو آراستہ کروانا شروع کیا تھا ۔ اس مقصد کے لئے خاص ملازمین رکھے گئے ۔ جنہوں نے اس خوبصورت اور عالی شان عمارت کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے ۔

شادی سے تین روز قبل ہی مہمان آنے شروع ہوگئے ۔ اور قصر

شباب میں خاصی چہل پہل ہو گئی ۔

عندلیب کی سہیلیاں تو کئی دن پہلے سے جمع تھیں ۔ جن میں وہ ثمینہ کو سب سے بڑھ کر چاہتی تھی ۔ اور خود لے کر آئی تھی ۔ اس کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی ثمینہ کو بہت پیار کرتی تھیں ۔ اس کے آجانے سے جیسے انہیں واقعی چاند چڑھ گیا ۔ ان کے علاوہ ہر ایک ثمینہ کی پرکشش شخصیت کا دلدادہ تھا ۔

قصر شباب کے دو کمرے اور ایک باتھ روم خاص طور پر اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا ۔ یہ کمرے باغ کی جانب تھے ۔ ثمینہ دن میں کئی دفعہ باغ میں جا نکلتی اور باغ کے حسن کا نظارہ کرتی ۔ باغ کا یہ حصہ تنہا تھا ۔ اور اس طرف اس نے آج تک کسی کو نہ دیکھا تھا ۔ مہمان زیادہ تر باغ کے دوسرے وسیع لان میں سیر کی غرض سے نکلتے ۔

آج بھی ثمینہ سیر کی غرض سے کمرے سے نکلی تو شام کا سلونا پن کافی بڑھ گیا تھا ۔ ہلکے ہلکے سرمئی بادل کسی حسینہ کے سرمئی آنچل کی طرح آسمان کے چوڑے سینے پر کہیں کہیں لہرا رہے تھے ۔

بہار کی خوشگوار ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی ۔ فضا میں چمیلی اور گلاب کی مسحور کن باس رچ رہی تھی ۔ اور درختوں پر شام کے پرندے شام کا راگ الاپ رہے تھے ۔ یہ کچھ ایسا رومان پرور ماحول تھا کہ ثمینہ کھو سی گئی ۔ سفید ریشمیں غرارہ فراک میں وہ پریوں کے دیس کی ملکہ نظر آ رہی تھی ۔

اس کے نیا اٹھا ہے شنلیں بال اس کے سڈول شانوں سے ہوتے ہوئے اس کی پنڈلیوں کو چھو رہے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہا کر آرہی تھی ۔ اور بالوں کو سوکھنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا ۔ اس کا سادہ اور معصوم حسن اس وقت غضب ڈھا رہا تھا ۔۔ افسوس کہ وہاں اس حسن کی سرکار میں سجدے کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ وہ خود سے بے نیاز حسن قدرت میں کھو چکی تھی ۔

یوکلپٹس کے اونچے درختوں کے تنوں سے لپٹی چمیلی اور گلاب کی بیلیں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں ۔ اس نے آگے بڑھ کر گلاب کے چند پھول توڑے اور اپنی سیاہ زلفوں میں سجالئے ۔ پھول مسکرا اٹھے ۔ جیسے وہ اس حسین مخلوق کی قربت پر فخر محسوس کر رہے ہوں ۔ ہاتھ میں تھامے چند پھولوں کو وہ گاہے گاہے سونگھ لیتی ۔ اسی کیفیت میں ڈوبی وہ ٹہل رہی تھی کہ اس سے چند قدم کے فاصلہ پر کرکٹ کا گیند آن گرا ۔ اور وہ چونک اٹھی ۔ ابھی وہ ادھر ادھر دیکھ ہی رہی تھی کہ شائد گیند پھینکنے والا نظر آجائے کہ دوسرے لان کی طرف سے ایک چھ سات سال کا بچہ بھاگتا ہوا آیا اور راستہ دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹھک گیا ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ——— اور وہ بڑے معصوم انداز میں شمینہ کو دیکھنے لگا ۔

" ادھر آئیے منّے !

شمینہ بچے کی محویت پر قدرے مسکراتے ہوئے اس سے

مخاطب ہوا۔

"آپ چاند کی شہزادی ہیں نا؟"

بچہ گیند کو بھول کر ثمینہ سے پوچھ رہا تھا۔

اس کے سوال پر ثمینہ زیر لب مسکرائی۔

"نہیں منے ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ادھر تو آیئے۔ اپنا گیند تو لیجئے۔"

ثمینہ کو یہ گول مٹول سا بچہ کتنا معصوم معلوم ہو رہا تھا اس کی بات پر وہ ابھی تک مسکرا رہی تھی۔

"نہیں آپ چاند کی شہزادی ہیں۔ رات ہی تو عرشی بھیا نے ہمیں چاند شہزادی کی کہانی سنائی تھی۔"

بچہ ابھی تک اپنی بات پر مصر تھا۔

"اچھا یہ لیجئے اپنا گیند!" ثمینہ نے گیند اس کی طرف بڑھا دیا اور بچہ حیرت سے اسے دیکھتا گیند لئے بھاگ گیا۔ ثمینہ دل ہی دل میں اس کے بھولے پن پر ہنس دی۔

ابھی اسے ٹہلتے تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ کہ کچھ فاصلہ پر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ اسی جانب دیکھنے لگی۔ اور ساتھ ہی بچے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"وہ رہی چاند کی شہزادی!"

ثمینہ نے دیکھا کہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر مولسری کے پیڑ

کے نیچے وہی بچہ اپنے ساتھ ایک نوجوان کو لئے کھڑا تھا۔ اور اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

وہ نوجوان پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا کرکٹ کا بیٹ زمین پر گر چکا تھا۔

شہینہ بھی چند ثانیے کے لئے اس اجنبی نوجوان کی پرکشش ہستی کی موجودگی میں سب کچھ بھول کر اسی میں کھو گئی۔ نوجوان کا خوبصورت دراز قد۔ سرخ و سفید رنگت اور سیاہ گھونگھریالے بال اس پر خوابیدہ سی آنکھیں اس کے وجود کو اس قدر جاذبیت بخش رہی تھیں کہ شہینہ چند لمحوں کے لئے کھو کر رہ گئی۔ لیکن اس بچے کی آواز نے دونوں کی محویت کو توڑ دیا۔

عرشی بھیا! آپ نے رات کو ان کی کہانی سنائی تھی نا۔؟ وہ نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں!" نوجوان نے کیفیت میں ڈوبی آواز میں جواب دیا۔

آپ کون ہیں اور اس طرف آنے کا مقصد؟

شہینہ جواب پوری طرح اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی اسے نوجوان کا یوں بیباکانہ اپنی طرف گھورنا ناگوار گذرا تھا —— اپنی شرم اور غصہ کو ضبط کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

" معاف کیجئے! میں اس وقت آپ کی تنہائی میں مخل

ہوا۔ در اصل منا مجھے زبردستی یہاں لے آیا۔ جو الفاظ آپ کی شان میں ابھی ابھی کہے گئے ہیں۔ مجھ سے بھی یہی کہنے لگا اور میں اس کی بات کو جھوٹ جان کر ٹال رہا تھا۔ لیکن یہاں آنے پر تو اس معصوم کے الفاظ کی تصدیق ہو گئی کہ آپ واقعی .... اوہ....
کچھ نہیں! ...

نوجوان ثمینہ کی خفگی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے وہاں چلے آنے کی صفائی پیش کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے دل کی ترجمانی کرتے کرتے چپ سا ہو گیا۔

اس کے الفاظ پر ثمینہ شرما سی گئی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنی اس شرم پر قابو پا لیا۔

"اچھا تو آپ جا سکتے ہیں!"

ثمینہ نے یہ الفاظ کہے تو لیکن اسے اپنی ہی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی جیسے وہ نہ کہنا چاہتی تھی۔ ایسے کہتے ہوئے دل کو دھکا سا لگا۔ اور اپنی اس یک دم تبدیلی پر وہ حیران و پریشان سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ نوجوان اور منا جا چکے تھے۔ اسے اپنا سانس گھٹتا سا محسوس ہوا۔ چند منٹ پہلے کی فضا ایک دم بدل گئی۔ اس نے کنول سی آنکھیں چاند پر گاڑ دیں۔ جو درختوں کی اوٹ سے جھانک کر شرما رہا تھا۔ جیسے کوئی دلہن آنچل کی اوٹ سے شرما کر جھانک رہی ہو۔

(۷)

سب لڑکیاں اس وقت عندلیب کے کمرہ میں جمع تھیں
کمرہ سریلے قہقہوں اور ہلکے پھلکے مذاق سے گونج رہا تھا۔ بے چاری عندلیب
ہر طرف سے اس دلنشیں سی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنائی جا رہی تھی
تھی۔

قیمتی ریشمیں لباسوں کی سرسراہٹ اور حسین جسموں سے
اٹھنے والی جانفزا مہک سے ماحول پر رومان آفرینیت چھا رہی تھی۔
مختلف رنگوں کے امتزاج نے کمرہ میں قوس و قزح سمٹ آئی تھی
عندلیب گاؤ تکیے سے سہارا لئے قالین پر بیٹھی تھی۔ اور دوسری لڑکیاں
اس کے گرد گھیرا ڈالے تھیں۔ لیکن ثمینہ ان میں موجود نہ تھی۔ اس کی
غیر موجودگی عندلیب اور سعدیہ کو بری طرح کھٹک رہی تھی۔ آخر اس
نے آہستہ سے سعدیہ کو ابھی بلوانے کے لئے کہا۔

میں تو خود سوچ رہی ہوں کہ کہاں چلی گئی کمرہ میں ایک دو دفعہ دیکھا ہے۔ وہاں تو نہیں ہے سعدیہ نے جواب دیا۔
انہیں آہستہ آہستہ باتیں کرتے دیکھ کر عندلیب کی چھوٹی بہن صدف ان کی طرف متوجہ ہوئی۔
"آپا راز و نیاز کیوں ہو رہے ہیں؟"
وہ بہن کو چھیڑنے کے انداز میں بولی۔
"خیر نہیں! یہ ثمینہ کہاں ہے اس وقت؟"
عندلیب اس کے استفسار پہ پوچھنے لگی۔
"اپنے کمرہ میں ہوں گی۔"
صدف نے جواب دیا۔
"وہاں تو نہیں ہے۔"
"میں دیکھ کر آؤں؟"
صدف نے پوچھا۔
"ہاں! ہاں! جاؤ!۔"
اور صدف ثمینہ کے کمرے کی طرف چل دی۔ ثمینہ کا کمرہ وہاں سے دور تھا۔ ثمینہ اسے راستے ہی میں مل گئی۔
"ارے باجی آپ کہاں تھیں؟"
صدف ثمینہ کے ہاتھ پکڑ کر اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔
"میں باہر چمن میں تھی۔"

ثمینہ نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔
ادھر آپا اور سعدیہ باجی آپ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک گئیں۔ سب لڑکیاں آپا جی کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔ سب ہی تو آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور آپ ہیں کہ نظر ہی نہیں آتیں۔ جائیے! ہم آپ سے نہیں بولتے۔!"

صائمہ مصنوعی ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا بھئی۔ خفا نہ ہو میں انہیں کے پاس جا رہی ہوں۔" ثمینہ اسے مناتے ہوئے بولی۔

وہ ہال کے پاس سے گذر رہی تھیں کہ ثمینہ کو وہی نوجوان ہال کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اور اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اپنے دل کے اس انداز پر وہ جھلا اٹھی۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" دل کی یہ دھڑکن! اف اللہ! میں کیا کروں؟"

ثمینہ خود سے مخاطب تھی۔ صائمہ اس کی اندرونی حالت سے بے خبر اس کا ہاتھ پکڑے چلی جا رہی تھی۔ اور پھر دونوں عندلیب کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔

اس کے جاتے ہی سب لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"محترمہ! کہاں کھو گئی تھیں!؟"

ثمینہ کی ایک اور سہیلی شازیہ نے پوچھا۔

"ہوا ہی باہر چمن میں !"

سعدیہ چونکہ اس کی اس پیاری عادت سے واقف تھی۔ شاذیہ کے سوال پہ بول اٹھی۔

"یہ کون سا وقت تھا تمہارا باغ میں گلگشت فرمانے کا ؟"

عندلیب نے پیار بھری خفگی سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

عندلیب کی اس بات پر شبنم سے جو سب سہیلیوں میں شریر مانی جاتی تھی ۔ خاموش نہ رہا گیا اور وہ بڑی بوڑھیوں کے انداز میں ثمینہ سے مخاطب ہوئی ۔

"اے ! جوان جہان لڑکیاں رات کے سمے باغوں میں نہیں ٹہلا کرتیں۔"

اس پہ کمرہ کھنکتے قہقہوں سے کشت زعفران بن گیا۔

"سچ ! تم نہیں تھیں ثمینہ ! تو محفل کچھ سونی سونی سی تھی۔"

ثمینہ کی ایک اور سہیلی عروسہ نے کہا۔

"میں تو نہایت بور قسم کی لڑکی ہوں عروسی ! تمہارا خیال غلط ہے۔"

ثمینہ نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تمام لڑکیاں اس کے اس سادہ حسن کو دیکھ کر دنگ رہ گئی

تھیں وہ اس سفید لباس میں واقعی چاند سے اتری شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ سب لڑکیوں میں وہ نمایاں تھیں۔ ہر ایک کی نگاہ اسی پر جم جاتی تھی۔ جو لڑکیاں اسے پہلے نہیں جانتی تھیں۔ اس کے متعلق چہ می گوئیاں کرنے لگیں۔ کچھ اس کے اس ملائیک فریب حسن پر مر مٹیں ——— !

"کاش! یہ لڑکی میری بھابی بن سکے!"

ایک خوبصورت سی لڑکی نے اپنے قریب بیٹھی دوسری لڑکی کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں ناجیہ! ارتی بھیا اور اس کی جوڑی تو خوب رہے گی۔"

اس لڑکی نے ثمینہ پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے پہلے والی لڑکی سے کہا۔

"تم عندلیب سے بات کرنا۔ اس کی تو بڑی گہری دوستی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں! موقعہ دیکھ کر بات کروں گی! بھئی! مجھے تو یہ پیاری سی لڑکی بہت پسند آئی ہے۔"

ناجیہ نے ثمینہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"

"اس میں تو شک نہیں ہے تو لاکھوں میں ایک!" وہ لڑکی

کہہ رہی تھی ۔

ثمینہ ان سے کچھ فاصلہ پر عندلیب سے باتوں میں مصروف تھی ۔ اس لئے وہ باتیں نہ سن سکی ۔

سب لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں کہ عندلیب کی امی کمرہ میں داخل ہوئیں ۔

"چلو لڑکیوں ! کھانا تیار ہے ۔"

انہوں نے سب پر پرشفقت نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ۔

ان کے کہنے پر سب لڑکیاں عندلیب کے کمرہ سے نکل کر قصر شہاب کے وسیع ڈائنگ روم کی طرف چلیں ۔

کمرہ میں ایک طرف بڑی سی میز پر مردوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کے لئے میز لگائی گئی تھی ۔

اس طرح مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ اس تقریب میں شامل ہونے والی پردہ دار عورتوں کا پوری طرح خیال رکھا گیا تھا

جب یہ لوگ ڈائینگ روم میں داخل ہوئیں تو سب مرد اپنی میز کے گرد جمع تھے ۔ لیکن کھانا شروع نہیں کیا تھا ۔ شاید وہ "لیڈیز فرسٹ" کے اصول پر قائم رہتے ہوئے خواتین کا انتظار کر رہے تھے ۔

ارشی کو یقین تھا کہ "چاند کی شہزادی" اور لڑکیوں کے ساتھ ضرور وہاں آئے گی ۔ وہ ثمینہ کو اسی نام سے یاد رکھے ہوئے تھا ۔ اسے

اس کا نام جو معلوم نہیں تھا۔
جس طرف سے لڑکیوں کو آنا تھا۔ ارشی کا منہ اسی دروازہ کی طرف تھا۔ اتنے میں لڑکیاں اندر آئیں ان میں ثمینہ کو دیکھ کر ارشی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کو وہاں لوگوں کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا۔ اور وہ خود کو بھول کر ثمینہ کی ذات میں کھو گیا۔ ثمینہ کو ارشی کی وہاں موجودگی کا علم نہیں تھا۔ وہ بغیر متوجہ ہوئی، میز کی طرف بڑھی اور اتفاق سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ارشی اپنی جگہ بالکل خاموش اور کھویا کھویا سا بیٹھا تھا اس کی یہ حالت کسی سے بھی نہ چھپی رہی۔

"ارے! یہ ارشی صاحب کہاں غائب ہیں؟ ایک لڑکا اس کی طرف اشارہ کر کے دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔
"پریوں کے گاؤں میں سیر کر رہے ہیں شاید!"
اس لڑکے نے ہنس کر شرارت سے جواب دیا۔
"ہوش میں آؤ میاں!"
ارشی کے ایک دوست عابد نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ تو وہ ایک دم چونک پڑا۔
"کھانا کھاؤ!" "پھر نظارہ بازی کرنا!"
عابد نے شرارت سے کہا۔
"نظارہ بازی نہیں، نظر بازی!"

ایک ۔ نجلبلہ صاحب نے چوٹ کی ۔

"کچھ ہی سمجھ لیں ! کوئی فرق نہیں پڑتا ۔"

عابد نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا ۔

ارشی ان کے اس مذاق پر دھیرے دھیرے مسکرا رہا ۔ اور ساتھ ساتھ بے دلی سے کھانا کھا رہا تھا ۔

ثمینہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھکی کھانے میں مصروف تھی ۔ لڑکوں کی موجودگی میں یہ لوگ بنا بہت خاموشی سے کھانا ختم کر رہی تھیں ۔

اور ثمینہ کھانا کھا کر اٹھنے لگی ۔ تو اس کی نگاہیں سامنے ارشی سے الجھ گئیں ۔ اور جیسے وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ۔ ارشی اس لمحہ کسی اور ہی دنیا میں تھا ۔

دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ۔

نہ جانے کون سی ایسی کشش تھی جو انہیں اس انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے پر مجبور کئے دیتی تھی ۔

"بس کرو دوست کہیں بے چاری کو نظر نہ لگا دینا ۔"

عابد نے ہلکے سے اس کے کان میں شرارت سے کہا ۔ تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا ۔

ثمینہ آہستہ سے اپنی جگہ پر سے اٹھی اور جانے لگی ۔ تو عندلیب نے اس کا ہاتھ تھام !

کہاں چل دیں ؟

وہ ثمینہ سے مخاطب ہوئی

" میں ابھی آتی ہوں ! "

ثمینہ نے اسے ٹالنے کے لئے کہا ۔ اور وہاں سے اپنے کمرے میں

چلی آئی ۔

نہ جانے روشنی کی لکیا ہوا ، میں کیا ہے ؟ کاش ! وہ مجھے یوں نہ

دیکھا کرے ۔ اس کی نظر میں میری روشنی بن اتر کر ۔ یہ کیسی ہلچل مچا دیتی ہیں

خدایا یہ چند گھنٹوں کے اندر مجھ میں تبدیلی سی پیدا ہو رہی ہے ۔ ایسی

کیفیت کبھی پہلے تو نہ تھی ۔ یہ دل جس انداز سے اب دھڑکنے لگا ہے ۔ یہ

دھڑکن پہلے کہاں تھی ؟ ۔ "

" اف خدایا ! میں کیا کروں ؟ یہ مجھے کیا ہونے لگا ہے ؟ "

ثمینہ بے چینی سے اپنے بستر پر اوندھے منہ گر گئی ! ۔ "

اس کی حالت دیکھ کر آپا جلدی سے اس کے قریب آئی ۔

" کیا ہوا میری بچی ؟ "

وہ اس کے اوپر جھکتے ہوئے بے تابی سے پوچھ رہی تھی ۔

" کچھ نہیں آپا ماں ! ذرا سر میں چکر آگیا ہے ۔ " وہ آپا کی گھبراہٹ

دیکھ کر بہانہ بنانے لگی ۔

" دوا دو سر دبا دوں ! "

آپا اس کے بالوں کو سمیٹتے ہوئے پچکار کر بولی ۔

نہیں آپا ماں آپ آرام کریں میں خود ہی اچھی ہو جاؤں گی ۔"
شمینہ نے اپنی طبیعت کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا ۔
"عندلیب کو بھیجوں ؟"
آپا اماں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا ۔
"نہیں ! نہیں ! میں تھوڑی دیر میں اچھی ہو جاؤں گی آپ لائٹ آف کر دیں ؟
شمینہ نے کہا ۔"
اور آپا بجلی بجھا کر دروازہ آہستگی سے بند کر کے دوسرے کمرہ میں چلی گئی ۔
شمینہ نے آنکھیں بند کرلیں اور ارشی کا تصور اس کے سامنے تھا ۔
"ارشی ! تم میری دنیا میں کیوں چلے آئے ؟ ..
خدا کے لئے چلے جاؤ ! لوٹ جاؤ ! مجھے اپنی دنیا میں اکیلا رہنے دو ۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے ۔"
میں نے بہت سے پروگرام بنا رکھے ہیں ۔ اگر تم اسی انداز میں میرے خیالوں میں آتے رہے تو مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا ۔ میں کسی قابل نہ رہوں گی ۔
"خدا کے لئے واپس لوٹ جاؤ !"
وہ ارشی کے تصور مخاطب تھی ۔

"نہیں! میں واپس جانے کے لئے نہیں آیا۔ ثمینہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ میں دل کی دنیا ایسا کر چلا جاؤں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں ثمینہ کہ مجھے اپنے دل میں بسا رہنے دو۔ یوں تو نہ نکالو۔ کیا جو اگر میں تمہارے دل میں رہوں تو۔ یوں بھی قدموں میں رکھو"

تصور کی مسکراہٹ التجا آمیز تاثر میں بدل گئی وہ ثمینہ کے پاؤں پر جھک گیا۔

اور ثمینہ نے اپنے پاؤں کھینچ لئے۔

نہیں ارشی تمہیں جانا ہی ہوگا۔

اس نے دیکھا کہ اس کے یوں دھتکارنے سے اس کی خوابیدہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ اور ثمینہ کو اس کی حالت پر ترس آگیا۔

وہ جانے کب تک ارشی کے تصور سے باتیں کرتی نیند کی آغوش میں پہونچ گئی تھی۔

---

(۸)

عندلیب کی شادی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔!

اس موقع پر قصرِ شباب دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ رنگا رنگ برقی قمقمے ہر ہر پتے کے ساتھ لگے تھے۔ وسیع لان شامیانوں کی چھتوں تلے چھپ گئے تھے۔ جن پر خوبصورت قالین بچھا دیئے گئے تھے نشست کے لئے جدید طرز کا فرنیچر سجا دیا گیا تھا۔ روشوں کی خوبصورتی میں اضافہ کے لئے ان پر بجری بچھا دی گئی تھی۔

اندر ہال میں خواتین کے لئے نشست کا انتظام کیا گیا تھا غرض یوں لگتا تھا کہ دنیا کی تمام تر رنگینی اور خوشیاں سمٹ کر قصرِ شباب میں آ گئی ہوں۔

رسیلی ہنسی اور مردانہ قہقہے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے

رنگیلے آنچل ہر طرف لہرا رہے تھے۔

عندلیب کی سہیلیاں اس کے گرد جمع تھیں۔ اور اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ تانیہ بھی اس کے قریب بیٹھی تھی۔ آج اس نے سرمئی سلک کی قیمتی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کا خوبصورت جسم اس ساڑھی میں کچھ اور بھی اُبھر رہا تھا۔ وہ آسمان پہ اڑتا ہوا بادل کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی۔

بالوں کا بڑا سا خوبصورت جوڑا اس کے گول چہرے پہ غضب ڈھا رہا تھا۔ جوہی کی نازک کلیوں کا ہار جوڑے کے گرد لپیٹ دیا گیا تھا۔ ہلکا سا زیور اس کے معصوم حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ اس تقریب میں شامل ہونے والی ہر لڑکی سے سادہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ ان سب میں ایک علیحدہ مقام پہ نظر آ رہی تھی۔ سب لوگ اس کی سادگی اور حسن کو نگاہ رشک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب کے تاثرات سے بے خبر عندلیب سے باتیں کر رہی تھی۔ کہ اتنے میں آپاجی نے اس کے باپ کے آنے کی اطلاع دی۔ اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ذوالفقار اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے ان کے علاوہ وہاں پہ سیٹھ شہاب اور اس کے جاننے والے جو ذوالفقار کے دوست بھی تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تانیہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ وہ ان صاحبان کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ اس لئے انہیں وہاں دیکھ کر کچھ شرما سی گئی۔

"آؤ بیٹی!"

سیٹھ صاحب نے اس کی شرم کو محسوس کرتے ہوئے اس کے سر پر شفقت انداز میں کہا۔

"یہ ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی ہیں۔"

سیٹھ صاحب نے باقی لوگوں سے اس کا تعارف کروایا۔

ثمینہ نے انہیں سلام کیا۔ اور اپنے باپ کے برابر والی کرسی پر آہستگی سے بیٹھ گئی۔

سب لوگ باتوں میں مصروف تھے کہ ملازم چائے کا سامان ٹرالی پر رکھے لے آیا۔

چائے تو ہماری بیٹی بنائے گی۔ کیوں بیٹی؟

سیٹھ صاحب نے ثمینہ سے کہا۔

"جی! بڑے شوق سے بناؤں گی۔"

ثمینہ اپنے شبنمی ہونٹوں پہ شرمیلی مسکراہٹ لیے اپنی نشست پر سے اٹھ کر چائے بنانے لگی۔

چائے کے دوران مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ خاصی دیر بیٹھنے کے بعد ذوالفقار علی نے سیٹھ صاحب سے جانے کی اجازت مانگی

آپ کل تک یہیں رک جائیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔

سیٹھ صاحب بڑے خلوص سے کہہ رہے تھے۔

"میں آپ کی نوازش کا احترام کرتا ہوں ! لیکن مجھے آج ہسپتال جانا ہے۔ چند مریضوں کی حالت خاصی مخدوش ہے۔ ورنہ میں آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کرتا۔"

ذوالفقار نے خاصے تکلف آمیز انداز میں معذرت خواہی کی۔

تو شام کو آپ کو کیا مصروفیت ہوگی۔ سیٹھ صاحب نے دریافت کیا۔

"شام کو تو کوئی خاص کام نہیں۔"

ذوالفقار نے جواب دیا۔

تو پھر شام کو تشریف لائیے گا۔ لیکن آپ وعدہ کیجئے کہ ضرور آئیں گے۔ سیٹھ صاحب نے وعدہ لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اور ذوالفقار نے ان کا اس قدر خلوص محسوس کرتے ہوئے شام کو آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور جانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ان کے ساتھ ہی وہاں پر موجود دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ سیٹھ صاحب اور ثمینہ بھی ساتھ تھے۔ سیٹھ صاحب برآمدے کی سیڑھیوں تک چھوڑ کر واپس چلے آئے اور ثمینہ باپ کو جاتے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑی رہی برآمدے کے ستونوں سے لپٹی چنبیلی اور گلاب کے پھولوں کو دیکھتی رہی۔

اس وقت وہاں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ وہ وہیں کھڑی تھی کہ کار کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ اور وہ اس طرف دیکھنے لگی۔ برآمدے سے کچھ فاصلے پر کار سے ارشی اتر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ثمینہ کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ وہ اس طرف آ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ثمینہ نے وہاں سے ہٹ آنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بظاہر لاپرواہی سے کھڑی رہی۔ اس وقت وہ نہ جانے کس دنیا میں تھی۔ اسے اپنے ارد گرد کا ہوش نہ تھا۔ اس کے دل و دماغ صرف ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ ارشی! ارشی!

وہ ثمینہ کے بالکل قریب تھا۔ اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"معاف کیجئے! میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

ارشی اس سے بڑے ملتجیانہ انداز میں مخاطب تھا۔

ثمینہ ایک لمحے کے لئے اس کے مخاطب کرنے پر اپنی متوالی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سرخ و سفید رنگ نیوی بلیو سوٹ میں کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ ثمینہ کو وہ اس بہت ہی اچھا لگا۔ لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں میں وہی عجیب سا جذبہ محسوس کرتے ہوئے وہ زیادہ دیر تک اس سے نگاہیں نہ ملا سکی۔ اور بڑے دلربانہ انداز میں اس کی گھنیری پلکیں اس کے سرخی مائل گندمی رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔ ارشی کو ثمینہ کی یہ ادا اس قدر بھائی کہ وہ اس کے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ ثمینہ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس

کر رہی تھی۔ اسے جانے کیا ہو رہا تھا۔ اس نے پل بھر کو پھر پلکیں اٹھائیں تو ارشی اسی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور تیز تیز قدم قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کے قدم بہک رہے تھے۔ ارشی اسے حیرت سے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چند منٹ پہلے کا کھلا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس کی حسین آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہیں کھڑا تھا۔ کہ عندلیب کی چھوٹی بہن ثمینہ کو ڈھونڈتی ادھر آنکلی۔ ارشی کو اداس سا کھڑا دیکھ کر وہ اس کے پاس گئی۔

"ارشی بھائی آپ اکیلے یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟"

صدف نے اس سے پوچھا۔

"ہوں؟"

ارشی محویت میں صرف اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

"آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

وہ ذرا اونچی آواز میں بولی۔

"کیا بتاؤں بھئی کہ میں یہاں کیوں کھڑا تھا۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"بتا دیں شاید میں آپ کے کچھ کام آ سکوں۔"

صدف نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ حالانکہ اسے دہاں پر کچھ دیر پہلے ثمینہ کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔

ارشی اس کے یہ کہنے پر چونک سا پڑا ۔ اس نے سوچا کہ شاید صدف نے ثمینہ کو اور اس کو ایک جگہ کھڑے دیکھ لیا ہے ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے لئے ثمینہ کی ذات پر کسی کو حرف لانے کا موقع ملے ۔ اس میں بے چاری ثمینہ کا کیا قصور ؟

وہ تو تنہا وہاں کھڑی تھی ۔ اس کی وجہ سے ثمینہ کے وقار کو ذرا سی ٹھیس پہنچے ۔ یہ ارشی کو گوارا نہ تھا ۔ اسے ثمینہ اور تنظیم کے گہرے دوستانہ تعلقات کا پتہ نہ تھا ۔ وہ ان ہی سوچوں میں کھویا تھا کہ صدف نے اسے پھر چونکا دیا ۔

" جواب نہیں دیا آپ نے ارشی بھائی ؟ "

وہ پوچھ رہی تھی ۔

" پھر کبھی بتاؤں گا ! "

ارشی نے اسے ٹالتے ہوئے جواب دیا ۔

نہیں ابھی بتایئے ۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے ۔ آپ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں ۔ کیا آپ مجھے بہن نہیں سمجھتے ۔

صدف بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی ۔

ارشی رشتہ میں صدف کا چچازاد بھائی تھا ۔ اس لئے یہ لوگ آپس میں کافی بے تکلف تھے ۔

ابھی صدف اس سے بحث کر ہی رہی تھی کہ اس کا دوست علید آ گیا ۔ اور اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑا ۔

عجیب گدھے ہو تم بھی ۔ صبح سے انتظار کر رہا ہوں اور جناب میاں
کہ ابھی تک غائب ہیں ۔ کہاں تھے تم ؟
وہ صدف کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہہ جا رہا تھا ۔
" یک نہ شد دو شد ۔ "
ارشی اپنے دوست کی غصہ بھری باتیں ان سنی کرتے ہوئے مسکرا کر
کہنے لگا ۔
اس پر صدف ہنسنے لگی ۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی ۔
" آپ دونوں تو جی بھر کر لڑ لیجیے ۔ میں تو چلی ! ۔ "
وہ جانے کے لئے مڑی تو ارشی نے اسے روکا ۔
" ناجیہ کہاں ہے صدف ؟
وہ اپنی چھوٹی بہن کے متعلق پوچھ رہا تھا ۔
" آپا کے پاس ہیں ۔ "
صدف نے جواب دیا ۔
" اسے میرے کمرے میں بھیجنا ذرا کام ہے ۔ " ارشی نے کہا
" اچھا ابھی کہے دیتی ہوں ۔ "
اور وہ عندلیب کے کمرے کی طرف چل دی ۔
ارشی اور عابد کچھ دیر تو وہاں کھڑے رہے ۔ اس کے بعد ارشی کھویا
کھویا سا اپنے کمرے میں آ گیا ۔

(۹)

آج عندلیب کی شادی تھی اور قصر شباب میں زمانے بھر کی رنگینیاں
اور رعنائیاں امڈ آئی تھیں ۔ بارات آنے میں ابھی کافی دیر تھی ۔ شادی میں
شرکت کرنے والوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا ۔ باہر مردانہ میں سیٹھ صاحب
اور ان کے لڑکے صمصام وطالب بجوش خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں
بڑے تپاک سے نفیس صوفوں پر بٹھاتے جا رہے تھے ۔ ادھر بیگم شباب
اور ان کی بہن قدسیہ بالا خواتین کو خوش آمدید کہتے ہوئے انہیں وسیع
ہال میں بچھے پر تکلف مسندوں پر بٹھا رہی تھیں ۔ غرض ہر سو حسن ہی حسن
تھا ۔ لڑکیوں میں سے کچھ ادھر ادھر انتظامات میں مصروف تھیں اور
کچھ بے چاری عندلیب کے گرد جمع اسے چھیڑ رہی تھیں ۔ اسے ابھی
دلہن نہیں بنایا گیا تھا ۔ کیونکہ یہاں کی رسم کے مطابق دلہن کا لباس

اس کے سسرال والے لا رہے تھے۔ اور سسرال میں سے سات سہاگنیں دلہن کو آراستہ کرنے والی تھیں۔

دوسری سب لڑکیاں زرق برق لباس زیب تن کئے تھیں۔ حسب عادت ثمینہ نے اس تقریب میں بھی سادگی کو اپنا رکھا تھا لیکن اس سادہ لباس میں بھی وہ وہاں پر موجود ہر لڑکی سے بڑھ گئی تھی اس کا کومل جسم ہلکے پیازی نائیلیکس کی قیمتی مگر سادہ ساڑی میں نگینہ کی طرح جھلملا رہا تھا۔ یہ رنگ اس کے سرخی مائل گندمی رنگ پر غضب ڈھا رہا تھا۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی دراز چوٹی اس کی پنڈلیوں کو چھو رہی تھی۔ ہلکا سا زیور کا سیٹ اس کے معصوم حسن کو بے حد دلکشی بخش رہا تھا۔ اس کا لا مثل فریب حسن آج ایک انوکھے پن سے دیکھنے والوں کو مرعوب کر رہا تھا۔ وہ عندلیب کے پاس بیٹھی تھی۔ اور عندلیب اسے پیار بھری نظروں سے بار بار دیکھ رہی تھی۔ یہ بات ثمینہ نے بھی محسوس کی لیکن خاموش رہی آخر سعدیہ سے نہ رہا گیا۔ وہ عندلیب سے پوچھ ہی بیٹھی۔

"خدا کرے کہیں تم ثمینہ کو نظر نہ لگا دینا۔"

اس میں میرا قصور تو نہیں ہے۔ ثمینہ سے پوچھو جو ایسے سامان پیدا کئے ہوئے ہیں۔

عندلیب نے ثمینہ پر پھر پیار بھری نظر پھینکتے ہوئے جواب دیا۔ اس پر ثمینہ کا حسین چہرہ شرم سے اور بھی خوبصورت ہو گیا۔

"یہ تو تم نے غلط کہا۔ ثمینہ بے چاری نے نہ تو غازے کا استعمال کیا ہے اور نہ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہیں جما رہی ہیں۔ یہاں تک کہ کاجل بھی تو نہیں لگایا۔ اس نے کب سامان کیے ہیں۔"

ارشی کی بہن ناجیہ جو چند روز ثمینہ سے کافی گھل مل گئی تھی عندلیب کی بات سن کر کہنے لگی۔ وہ تو ثمینہ کو بہت چاہنے لگی تھی۔

ایسی باتیں سن کر ثمینہ عرق عرق پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس کی فطری حیا اس بات کو بھی نہ برداشت کر سکی۔ کہ اس کی ہم جنس اس کے حسن کی تعریف کریں۔

"ارے ثمینہ باجی! آپ تو یوں شرما رہی ہیں۔ جیسے ہم سب لڑکے ہیں۔ اور آپ کو چھیڑ رہے ہیں۔"

صدف ثمینہ کو شرماتے دیکھ کر بولی۔

ناجیہ کو اس کی یہ ادا اتنی بھائی کہ وہ دل ہی دل میں اس لڑکی کو جلدی سے اپنی بھابی بنا لینے کا تہیہ کر بیٹھی۔ یہ قدرتی بات تھی۔ کہ ثمینہ بھی ناجیہ کو بہت پسند کرنے لگی تھی۔ ناجیہ کی موہنی صورت اور اس کی خوش خلقی ثمینہ کے دل میں بھی گھر کر چکی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ ارشی کی بہن ہے۔

ان باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ بارات آنے کی خبر ملی اور یہ خبر سنتے ہی لڑکیاں دولہا کو دیکھنے کی آرزو میں برآمدے کی طرف لپکیں۔

ثمینہ کو ایسی باتیں پسند نہ تھیں کہ خواہ مخواہ سے لئے بچوں کی طرح بھاگا

جائے۔ آخر دولہا کو اندر لایا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر اسے دیکھ لیا جائے یہ سوچ کر وہ عندلیب کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ناجیہ اور سعدیہ نے اس کی تقلید کی۔ چند لڑکیوں کے علاوہ باقی سب جا چکی تھیں۔

عندلیب نے فرطِ حیا سے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لڑکیوں کو اسے چھیڑنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا۔

"بھئی یہ ہم سے شرمایا جا رہا ہے یا دولہا بھائی کے آجانے کا خدشہ ہے۔"

ثمینہ نے اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔ دولہا کے نام پر اس کا سفید رنگ سرخ ہو گیا۔

"نہیں! نہیں! تم سمجھی نہیں ثمینہ! یہ تو پریکٹس ہو رہی ہے۔"

ناجیہ نے عندلیب کو چھیڑنے کے لئے ثمینہ کو مخاطب کیا۔

"وہ کیسے؟"

ثمینہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"جب دولہا بھائی آئیں گے۔ تو یہ بے چاری ان سے اس انداز میں چہرہ چھپائے گی۔"

ناجیہ نے اپنی بات کی تشریح کی۔

ادھر عندلیب کا مارے شرم کے برا حال تھا۔

"بھئی تم لوگ کیوں میری بہن کو ستا رہی ہو۔"
ثمینہ نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔
اتنے میں عندلیب کے سسرال سے خواتین اس کے کمرہ میں چلی آئیں۔ رسم کے مطابق سات سہاگنوں نے دلہن کو سجانا تھا۔ اس لئے باقی عورتوں کو بڑی عزت سے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔
ادھر عندلیب کو عروسی جوڑا پہنا کر آراستہ کیا جا رہا تھا۔ ثمینہ کسی کام کی غرض سے اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ وہ اپنے کمرہ کی طرف جا رہی تھی۔ کہ راستہ میں اسے ارشی مل گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ واپس پلٹ جائے۔ لیکن کسی خیال سے اس نے اپنے قدم نہ روکے۔ کل کے واقعہ سے وہ ارشی سے کچھ زیادہ ہی کترانے لگی تھی۔ وہ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے بالکل خبر نہ ہوئی تھی کہ ارشی بھی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ دم لینے کی خاطر اپنے بستر پہ نیم دراز ہو گئی۔ ارشی دروازے کے پردے ہٹائے دہلیز میں کھڑا تھا۔ وہ اسے مخاطب کرنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ اور آخر اس نے قوت گویائی کو اکٹھا کر ہی لیا۔
"کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔"
ارشی کی مخمور آنکھوں میں چمک اس وقت کتنی بڑھ گئی تھی۔
اس کی آواز سن کر ثمینہ اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اور چند ثانیے اسے متحیر نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"آپ کیسے میرے کمرے تک آ گئے۔"

وہ گھبراہٹ سے پیچھے ہٹتے ہوئے صرف اسی قدر کہہ سکی۔

"اپنے پاؤں سے چل کر۔"

ارشی سب کچھ بھول کر شرارت آمیز انداز میں بولا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔"

ثمینہ اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"آپ کے تشریف لانے کا مقصد؟"

ثمینہ نے بڑے پر تکلف انداز میں پوچھا

"دراصل آپ کی ایک چیز لوٹانے آیا ہوں۔"

ارشی نے پتلون کی جیب میں ایک رومال کے حصار میں بند انگوٹھی کو ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔

اس پر ثمینہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ وہ کون سی چیز ہے جو ارشی کے پاس پہنچ گئی۔

اور وہ ثمینہ کو یوں سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر اس کے معصوم حسن میں کھو گیا۔

"نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میری کوئی چیز نہیں کھوئی۔ نہ کوئی چیز آپ کے پاس ہے۔"

ثمینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

دکل والی بات یاد ہے ۔جب بہا در سے میں کھڑی تھیں ۔ پھر کسی کے بلو چھونے پر آپ اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ آئیں ۔ لیکن کسی کی دی ہوئی اس نشانی کا تو خیال رکھا ہوتا ۔ جو آپ کی مجھ سے نفرت کی وجہ ہے ۔"

ارشی اپنی جیب سے وہ رومال نکالتے ہوئے بڑے کرب ناک اور اداسی میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہہ رہا تھا ۔اس نے اس طنزیہ انداز میں اپنے دل کا حال ثمینہ کے آگے بیان کر دیا تھا ۔

اور ثمینہ کی آنکھوں کے سامنے دکل کی اس چھوٹی سی ملاقات کا نقشہ کھینچ گیا ۔ اسے یاد آیا کہ زیور پہنتے ہوئے ۔اس کی ایک انگوٹھی اسے بہت ڈھیلی تھی ۔ اور اس نے اسے اتار کر اپنے رومال کے ساتھ باندھ دیا تھا ۔ اور دکل اس وقت بے خیالی میں اور گھبراہٹ میں رومال اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا ۔ جو ارشی نے اٹھا لیا ہوگا ۔ اور اب وہ اس انگشتری کو شاید اس کی منگنی کی انگوٹھی سمجھ کر اپنے دل میں ایسے خیال پیدا کئے ہوئے تھا ۔

ارشی کی ان چوٹوں سے اسے بہت تکلیف ہوئی ۔لیکن وہ خاموش رہ گئی ۔کچھ بھی تو نہ کہہ سکی ابھی سے ۔ اس کی یہ غلط فہمی نہ دور کر سکی ۔

اسے یوں چپ اور اداس سا دیکھ کر ارشی کا شک یقین میں بدل گیا ۔ اس نے سوچا شاید وہ ماضی کی یادوں میں کسی کو تلاش کر رہی ہے ۔ بدگمانی اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس انگوٹھی کو کسی اور انداز میں

نہ دیکھ سکا ۔

"ابھی میں چلا جاؤں تو پھر یادوں میں کھو جائے گا پہلے اس امانت کو سنبھالیے ۔"

اس نے انگوٹھی ثمینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے ملیکہ اور تیر چلا دیا۔

اور اس کے ان الفاظ پر ثمینہ کا خون کھول اٹھا ۔ اسے ایک مرد کے منہ سے اپنے لئے ایسے الفاظ بہت ناموزوں معلوم ہوئے وہ ابھی تک اس کی سب باتیں بڑے تحمل سے سنتی آئی تھی ۔ لیکن اب وہ برداشت نہ کر سکی ۔

"آپ کو میری کسی بات میں دخل دینے کا حق نہیں ۔"

آپ کون ہوتے ہیں میری ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے والے ۔ یہ انگوٹھی میری اپنی ہے یا کسی کی دی ہوئی ۔ آپ کو اس سے کیا غرض ؟"

"معاف کرنا ثمینہ! میں یہ بھول گیا تھا کہ تم غیر ہو ۔ واقعی مجھے تمہاری پرائیوٹ زندگی میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں ۔ یہ میرا دیوانہ پن تھا کہ میں تمہیں اپنا . . . . خیر چھوڑو ۔ میں یہ کیا کہہ دینے والا تھا ـــــ !"

ارشی کے ہونٹ فرط غم سے لرز رہے تھے ۔ اس کے ہاتھوں میں ثمینہ کا رومال کانپ رہا تھا ۔ اس کے کونے پر ثمینہ کا نام اس کا منہ چڑا رہا تھا ۔

، اس کی آنکھوں میں اشتعال جیسی جھلک آگئی تھی مگر اس نے
اپنے لب کاٹ لئے اور صرف کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

" مجھے معاف کر دینا ثمینہ! میرے الفاظ کو بھول جانا۔ مجھے کتنا دکھ ہے کہ میری باتوں سے تمہارا دل دکھی ہوا۔"

ارشی نے نا پختہ الفاظ میں ثمینہ کو بڑی حسرت سے مخاطب کیا اور اس پر ایک بھرپور نگاہ پھینکتے ہوئے تیزی سے کمرہ سے باہر چلا گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ثمینہ کچھ سوچ بھی نہ سکی۔

اس کے پاؤں کے پاس پڑی انگوٹھی کا یاقوت اسے ایسا نظر آرہا تھا۔ گویا اس کی تمنا دل کا سارا خون اس میں جذب ہو گیا ہو۔

اور ثمینہ نے بڑی بے چارگی سے اپنا سر اپنے گھٹنے سے ٹیک دیا۔ اور بڑی حسرت سے پھولوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جو ارشی کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

---

(۱۰)

عندلیب دلہن بن چکی تھی۔ اور نکاح بھی ہو چکا تھا۔ شمینہ اس اچانک سانحہ کے بعد خود کو کچھ کمزور سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے لیکن اس موقع پہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کسی کو بھی اس بات کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بڑی بے دلی سے اٹھی اور خود پہ بے حد جبر کرتے ہوئے عندلیب کے کمرے میں آگئی جہاں اب ہر قسم کی عورتیں جمع تھیں۔ وہ خاموشی سے عندلیب کے پاس بیٹھ گئی۔ سعدیہ اس کی اڑی اڑی سی رنگت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے شمینہ طبیعت کیسی ہے؟"

سعدیہ پوچھ رہی تھی۔

"سر میں شدید درد ہے۔ اسی لئے تو کمرہ میں لیٹی رہی۔ لیکن آرام ہی نہیں آرہا۔ سوچا کہ تمام لوگ نہ جانے کیا سوچیں گے۔ اسی لئے چلی آئی۔"

ثمینہ نے بہانہ بنایا۔

عندلیب بے چاری بھی ثمینہ کی طبیعت کے متعلق سن کر قدرے متفکر ہوئی لیکن سسرال والوں کی موجودگی میں کچھ نہ کہہ سکی اسے معلوم تھا کہ شور اور بے آرامی کی وجہ سے ایسی تقاریب میں ثمینہ کی طبیعت اکثر خراب ہو جایا کرتی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر دولہا کو اندر لایا گیا۔ دلہن کو اس کے قریب بٹھا دیا گیا۔ آرسی مصحف کی رسم کے بعد دولہا کو عورتوں نے رونمائی دی۔ دلہن کی سہیلیوں اور رشتہ کی بہنوں نے دولہا کو خوب تنگ کیا۔ اور اس سے بہت سے روپے حاصل کئے۔ بہت سی رسوم کے بعد عندلیب والدین، بہن اور دوسرے عزیزوں کی دعاؤں اور آنسوؤں کی برسات میں رخصت ہونے لگی۔ اور اپنی سہیلیوں سے لپٹ کر خوب روئی۔ ثمینہ کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ اسے ایک بہانہ مل گیا۔ اور اس نے دوہری کسر نکالی۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے نزدیک پھولوں سے لدی دولہا کی لمبی ایمپالا دلہن کے انتظار میں کھڑی تھی۔

ثمینہ اپنی عزیز ترین سہیلی کو رخصت کر رہی تھی۔ اس کی

آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ریشمیں رخساروں کو بھگو رہی تھیں۔ اس موقعہ پر برآمدے میں اور لوگوں کے ساتھ ارشی بھی تھا۔ لیکن ثمینہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ ارشی کو یہ روتی ہوئی معصوم سی لڑکی انتہائی پیاری لگی۔ کہ وہ سب کی موجودگی بھول کر اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں کھو گیا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر پہلے کی ثمینہ کی باتیں بھی اس کے ذہن سے نکل گئیں۔

اس کی یہ کیفیت اس کے دوستوں سے چھپی نہ رہ سکی۔

"اوہ! یہ تو ارشی کی دنیا میں کھو گئے۔"

عابد نے اس کے منہ کے آگے انگلیاں نچاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں نگاہیں ترے چہرے سے ہٹاؤں کیسے۔"

اس کا ایک اور دوست رضوان اسے چھیڑنے کی غرض سے گنگنانے لگا۔

اور دوستوں کی اس چھیڑ چھاڑ نے اسے چونکا دیا۔

"دوست! معلوم ہوتا ہے کہ تم اس غریب لڑکی کو نظر لگا کر ہی باز آؤ گے۔"

عابد نے مذاق کیا تو اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور ثمینہ کے الفاظ اس کے کانوں میں نشتر چبھونے لگے۔

کار دلہن کو لئے آہستہ آہستہ گیٹ سے نکل رہی تھی۔ اور اس کے رخصت ہوتے ہی قصر شہاب کی ساری رونق بھی رخصت ہو گئی۔

اور اتنے ہجوم کی موجودگی میں بھی یہ جگہ ویران سی ہو گئی۔ بیگم شہاب

مار وتے روتے برا حال تھا۔ صدف اور خاندان کی دوسری عورتیں انہیں چپ کرا رہی تھیں۔

شام ہوتے ہوتے تقریباً تمام مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ جو لوگ دوسرے شہروں سے آئے تھے۔ وہ دوسرے دن کا انتظار کرنے لگے۔ ان میں عرشی اور اس کی بہن ناجیہ بھی تھے۔

آخر ثمینہ نے بھی جانے کے لئے بیگم شہاب سے اجازت مانگی لیکن صدف نے اور انہوں نے بڑی ضد کر کے اسے روک لیا۔ ناجیہ بھی اس کے رک جانے سے کافی خوش تھی۔ ذوالفقار علی کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد گھر چلے گئے۔

---- - ؞ - - - --

(۱۱)

رات کے کھانے پر پرویز کی غیر حاضری ثمینہ کے علاوہ سب کو محسوس ہو رہی تھی ۔ ملازم کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا ۔ لیکن وہ وہاں بھی نہ تھا ۔

" ہو سکتا ہے اپنے کسی دوست کے ساتھ چلا گیا ہو ۔ بیگم شہاب نے خیال دوڑایا ۔

" نہیں بیگم ! وہ مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جاتا ۔ بڑا سعادت مند بچہ ہے ۔ "

سیٹھ صاحب نے بیوی کے خیال کی تردید کی ۔

اسکی بھیا بھی عجب ہیں ۔ سب کو اپنی خاطر فکر میں ڈال دیا ۔"

ناجیہ نے پریشان سے انداز میں کہا تو ثمینہ کو پہلی دفعہ اس

بات کا علم ہوا کہ ناجیہ اور ارشی آپس میں بھائی بہن ہیں ۔ اور یہ جان کر اسے نہ جانے کیوں خوشی ہوئی ۔

وہ بظاہر غیر متعلق سی خاموشی سے کھانے میں مصروف تھی ۔ لیکن اس کا دل اندر ہی اندر ہی ڈوبا جا رہا تھا ۔ اسے آج دوپہر کا واقعہ بار بار یاد آ رہا تھا ۔ ارشی اس کی طرف سے ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا ۔

" اف ! یہ کیا ہوا ؟ ابھی تو ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی ـــــ اس کے دل کی دنیا میں ابھی تو بہار نے قدم رکھا ہی تھا ۔ یہ خزاں اچانک کہاں سے آ پہونچی ؟ "

ثمینہ متواتر یہی سوچے جا رہی تھی ۔ وہ کیسے ارشی کی غلط فہمی دور کرے ۔؟ ۔ اسے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا ۔

آہستہ آہستہ سب لوگ کھانا ختم کر کے اٹھتے گئے اور ثمینہ بھی صدف اور سعدیہ ، ناجیہ وغیرہ کے ساتھ ڈرائینگ روم میں آ گئی ۔

عندلیب کے چلے جانے کے بعد گھر بہت سونا سونا ہو گیا تھا بیگم شہاب اپنی چند ہم عمر عورتوں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئیں ۔ وسیع ہال میں کچھ لڑکے تاش کھیلنے لگے ۔ تو کسی نے کیرم سنبھال لی لیکن ارشی کے بغیر اس کے دوست بوریت سی محسوس کر رہے تھے ۔ عابد اور رضوان کو رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا تھا ۔

" عجب الو ہے یہ لڑکا ۔ نہ جانے کیا ہوتا ہے اس کو بیٹھے بیٹھے کر اٹھ

کہ کہیں چلا جاتا ہے۔"

عابد نے دانت پیس کر کہا۔

اور اس کی اس بات پہ سب ہنسنے لگے۔

"سارا مزہ کرکرا کر دیا اس احمق نے۔"

رضوان بڑبڑا رہا تھا۔

"سوچا تھا آج اس سے ستار پہ کوئی اچھی سی غزل سنیں گے۔"

ساجد نے افسوسناک سے لہجے میں کہا۔

"تو یہ عرشی صاحب ستار بجانا اور گانا بھی جانتے ہیں۔" یہ سن کر ثمینہ کو عرشی پہ پیار سا آگیا۔

ناجیہ خاموش سی بیٹھی تھی۔ اسے اپنے بھائی کی طرف سے فکر ہو رہا تھا۔

"ہماری ثمینہ باجی اتنا اچھا ستار بجا لیتی ہیں۔ کہ عرشی بھائی کیا بجائیں گے۔ صدف نے پیار سے کی طرف دیکھ کر ساجد کی بات کا جواب دیا۔

"صدف کی بچی یہ تم نے کیا کیا۔"

مارے شرم کے ثمینہ کا برا حال تھا۔ اس نے قریب بیٹھی صدف کے چٹکی لی۔

صدف کے کہنے پہ سب لڑکے اور لڑکیاں اس سے ستار پہ غزل سننے کی فرمائش کرنے لگے۔

اس وقت بزرگوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ثمینہ اپنی
شرمیلی تھی۔ چند کے اور لڑکوں کے سامنے گانے پر آمادہ نہ ہو سکی۔
آخر بڑی کوشش اور ضد سے اسے مجبور کر دیا گیا۔ اور وہ گانا سنانے
پر تیار ہو گئی۔ صدف نے اس کے آگے ستار رکھ دی۔

"کاش! اس وقت وہ گدھا بھی ہوتا اور اپنی ... کا گانا
لیتا۔ کتنا بدنصیب ہے۔" عابد نے آہستہ سے رضوان کے کان میں
کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا۔" رضوان نے جواب دیا۔

ثمینہ کی اپنی مخروطی انگلیاں ہولے ہولے ستار کے تاروں کو چھیڑ
رہی تھیں۔ کمرے کا سکوت اس دلفریب گونج سے ٹوٹ رہا تھا۔ ستار
پر جھکی ہوئی وہ کسی آرٹسٹ کا حسین شاہکار دکھائی دے رہی تھی۔ اس
وقت اس کا حسن ایک نئے انداز میں تھا۔ وہ اپنی پرسوز آواز میں
شکیل بدایونی کی یہ غزل بڑے پیارے انداز میں گا رہی تھی۔

خیال غیر کو در سے بھلا دو یا رسول اللہ
خرد کو اپنا دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ

تجلی طور پر جس نور کی دیکھی تھی موسیٰ نے
ہمیں بھی اک جھلک اس کی دکھا دو یا رسول اللہ

حسین ابن علی کے صبر نے جس کے مزے لوٹے
ہمیں بھی اس بلا کا حوصلہ دو یا رسول اللہ

ثمینہ کی آواز میں کچھ ایسا درد تھا۔ کہ سامعین میں سے کئی ایک کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس کی غزل کے بول اور اس کی آواز کے سوز نے ان کی روحوں کو تڑپا دیا۔ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اتنا پیارا تھا کہ سب اس وقت وجد میں تھے۔

وہ غزل ختم کر چکی تھی۔ کہ کمرے کے باہر آہٹ ہوئی۔ اور عرشی پردے ہٹا کر داخل ہوا۔ وہ باہر کھڑا ہوا گانا سن رہا تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ اتنی پیاری آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ اور اس تجسس نے اسے اندر آنے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا جب اس نے ثمینہ کے سامنے ستار کو دیکھا تو وہ چند لمحوں کے لئے وہیں ٹھہرا رہ گیا۔

صورت کی طرح آواز بھی کس غضب کی پائی ہے۔ روح کو تڑپا دینے والی! کاش دل بھی گوشت پوست کا ہوتا۔

وہ سوچے جا رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر ثمینہ نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن اپنے سامنے دو حسین اور شاکی نگاہوں کو پا کر اس نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ شاید مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔

ادھر سب لوگ تالیوں سے اس کے گانے کی داد دے رہے تھے لیکن ثمینہ سن سی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔

"اف! عرشی نے بھی میرا گانا سن لیا ہوگا۔" وہ سوچ کر شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

"دوست تم نے اتنا اچھا موقعہ کھو دیا۔ کاش تم بھی غزل سنتے۔"

عابد شرارت سے مسکراتے ہوئے ذومعنی انداز میں عرشی سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے سن لیا ہے۔" عرشی نے بظاہر بے دلی سے کہا اور واپس پلٹا۔

"ارے بھئی! اب تمہاری باری ہے۔ کہاں چلے ہو؟"
رضوان نے پیچھے سے آواز دی۔

"کمرے میں جا رہا ہوں۔ طبیعت اچھی نہیں!"
عرشی نے جاتے جاتے جواب دیا۔

اس کے اس طرزِ عمل کو سب نے محسوس کیا۔ ثمینہ کو بہت دکھ ہوا۔ لیکن وہ انجان سی بنی رہی۔

ناجیہ اٹھ کر بھائی کے پیچھے لپکی۔ اور اس کے بعد سب اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جلد بیٹے۔

ثمینہ اور سعدیہ بھی چلی آئیں۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ثمینہ نے دیکھا کہ عرشی کے کمرے کی بجلی جل رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی آیا ماں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی کیسا ہے بٹیا؟"
آیا ماں اس کے اداس اور اترے ہوئے چہرہ کی طرف دیکھ کر

بولیں۔

"اچھی ہوں آپا اماں۔"

ثمینہ اپنی دلی حالت چھپاتے ہوئے بولی۔

گھر کب ہو گی بیٹی؟"

آپا ماں پوچھ رہی تھیں۔

"ابو کل نمشتہ کے بعد آکر لے جائیں گے۔"

ثمینہ نے جواب دیا

اور وہ لباس تبدیل کرنے غسل خانہ میں چلی گئی۔

آپا اس کے لئے دودھ کا گلاس لے آئی۔

"میرا جی نہیں چاہتا آپا اماں! آپ نے ایسے ہی تکلیف کی۔"

ثمینہ کپڑے بدل کر واپس آچکی تھی۔ اور اب آپا کے اصرار پر دودھ پینے سے انکار کر رہی تھی۔

لیکن آپا نے ضد کر کے اسے دودھ کا پورا گلاس پلا ہی دیا۔

"آپ جا کر آرام کریں!"

ثمینہ نے آپا سے کہا

"جب تک میری رانی بٹیا نہ سو جائے۔ میں کیسے آرام کر سکتی ہوں۔"

آپا نے ماں کی سی شفقت سے کہا۔

"نہیں آپا ماں! میں خود ہی سو جاؤں گی۔ آپ جائیں!" ثمینہ نے جواب دیا۔

اس پر آیا ساتھ والے کمرہ میں سونے کے لئے چلی گئی۔

رات نے ہر شئے کو میٹھی نیند میں سلا دیا تھا۔ لیکن قصر شہاب میں دو انسان ایسے تھے۔ جو اپنی اپنی جگہ تڑپ رہے تھے۔ اور نیند ان سے روٹھ کر نہ جانے کن خوش نصیب انسانوں کو لوری دینے جا چکی تھی۔

دور گھڑیال نے دو بجنے کا اعلان کیا۔ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر نعیمہ تھک چکی تھی۔ اس لئے پلنگ سے اتر کر وہ کمرہ میں ٹہلنے لگی۔ اس کی کنول جیسی خوبصورت آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سے خود پر بڑا طرح غصہ آ رہا تھا۔ " آخر یہ دل میرے قابو میں کیوں نہیں۔ اپنے آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ تم بھی تو کسی صورت اسے یا ہی نہیں! "

وہ کھڑکی کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

پچھلے پہر کی چاندنی ٹھنڈی، چاندنی تھی۔ جب یہ دوا میں سے چھن چھن کر کمرہ میں دودھیا سی روشنی پھیلا رہی تھی۔ اس نے پردے ہٹا دیئے اور باہر کا نظارہ کرنے لگی۔

چمن کا پتہ پتہ اس وقت چاندنی میں نہا رہا تھا۔ اور بہار کی خوشگوار ہوائیں پھولوں اور کلیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ باہر نکل کر اس پر فسوں ماحول سے لطف اندوز ہو۔ لیکن اسے کچھ ڈر سا محسوس ہوا۔ اور وہ اپنا ارادہ ترک کر کے اپنے بستر پر آن گری تا وہ جاگ ہی رہی تھی کہ قریب کی مسجد سے فجر کی اذان ہونے لگی

وہ اٹھی۔ وضو کیا اور سجدۂ حقیقی کے آگے جھک گئی۔ نماز پڑھنے کے بعد اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی۔ اور باہر چمن میں ہوا خوری کے لئے نکل آئی۔ قصرِ شہاب میں سب لوگ جاگ چکے تھے۔ اور حسبِ معمول روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔

اس نے اپنے سفید دوپٹے میں موتیے کی ڈھیر ساری کلیاں جمع کر لیں اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ کہ کوئی دیر سے اپنے کمرہ کی کھڑکی میں کھڑا اس کی اس مصروفیت کو انتہائی چاہت سے دیکھ رہا ہے۔

آنچل میں کلیاں بھرے وہ کسی کے من مندر کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔

" آہ! کتنا خوش نصیب ہوگا وہ انسان جس نے ثمینہ کو پا لیا ہے۔ "

طارق ابھی تک انگوٹھی والی بات نہ بھول سکا تھا۔ اور یہی سمجھے ہوئے تھا۔ کہ ثمینہ کسی کی منسوبہ ہے۔ کل سے یہ خیال ہی تو اسے پاگل بنائے دے رہا تھا۔

ثمینہ کتنی ہی دیر چمن میں محو گلگشت رہی۔ اور پھر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ جہاں آپا ماں اس کو ناشتہ کی میز پر چلنے کے لئے کہنے آئی تھیں۔ اور وہ پھولوں کو اپنے بستر پر ڈال کر خود ناشتہ کرنے چلی گئی۔

رات کی طرح آج بھی طارق موجود نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری سے ثمینہ کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ اور وہ بادل ناخواستہ صرف کے ساتھ والی کرسی

پر بیٹھ گئی۔ اسے آئے تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ کہ عرشی اور ناجیہ بھی آگئے۔ سیٹھ صاحب اور ان کی بیگم کو سلام کر کے ثمینہ کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

رات بھر جاگتے رہنے سے دونوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ناجیہ نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ تو وہ افسردگی سے مسکرادی۔

"کہو ثمینہ بیٹی ابھی تو تم یہیں ٹھہرو گی نا؟۔

سیٹھ صاحب نے اس سے پر شفقت انداز میں پوچھا۔

"بچا حضور! ابوجان کسی کام کے سلسلے میں شملہ جا رہے ہیں اس لئے وہ آج ہی مجھے لینے آئیں گے۔ ورنہ میں بخوشی یہاں ٹھہرتی۔،

ثمینہ نے بڑے پیارے انداز میں سیٹھ صاحب کی بات کا جواب دیا۔ اس دوران سب کی توجہ اس بات کے علاوہ اس کے دلفریب چہرہ کی طرف تھی۔

عرشی کا عالم تو کچھ اور ہی تھا۔ اس کی نظریں تو ثمینہ کے حسین رخِ انور ہی کی ہو کر رہ گئیں۔

ناجیہ اور صدف نے ایک ٹک اسے ثمینہ کی طرف دیکھتے پایا تو وہ شرارت سے مسکرادی۔ ان کی یہ شریر مسکراہٹ ثمینہ سے بھی نہ رہ سکی۔ اور اس کی نگاہیں بے اختیار عرشی کی طرف اٹھ گئیں۔ جو متواتر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس پر بے چاری ثمینہ پسینہ سے شرابور ہو گئی اسے اس وقت عرشی کی اس حرکت پر خوب غصہ آیا۔

"اونہہ! ایسا بھی کیا ؟ کہ انسان اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا یہ ضرور مجھے بدنام کرکے رہیں گے۔"

ثمینہ کی حسین پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں جنہیں سعدیہ ناجیہ اور صدف نے محسوس کیا کہ عرشی کا یوں گھورنا اسے ناگوار گذرا ہے۔

بھائی کی اس بات پر ناجیہ خفیف سی ہو گئی۔

"عرشی بھائی! آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ لائیے اور چائے بنا دوں۔"

صدف نے شریر نگاہوں سے عرشی کی طرف دیکھا۔ تو وہ چونک پڑا۔

اور اس کی یہ حالت کسی سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ اور پیالی صدف کی طرف بڑھا دی۔

اس کے دوست بزرگوں کی موجودگی میں خود کو ضبط کئے بیٹھے تھے ورنہ ان کے ہاتھ عرشی کو ستانے کا اچھا بہانہ آگیا تھا۔

ارشی صرف چائے کی پیالی پی کر اٹھنے لگا۔ تو سیٹھ صاحب نے اسے روکا۔ اور بولے۔

"بیٹا! تم نے تو چائے کے ساتھ کچھ بھی نہیں لیا۔ یہ تو بری بات ہے۔ یہاں تکلف ہرگز نہ چلے گا۔"

"نو تھینکس انکل! میں اکثر صبح چائے کے ساتھ کچھ نہیں کھاتا۔" ارشی نے انہیں ٹالنے کے لئے جھوٹ بولا۔

"رات بھی تم کھانے پر نہیں تھے۔" یہ تو اچھی بات نہیں۔" بیگم شہاب نے کہا۔

"وہ دراصل میرا ایک دوست مجھے اپنے ہاں لے گیا تھا۔" اسی نے چینے کے ساتھ بہت کچھ کھلا دیا۔ ارشی بے چارہ بزرگوں کی گرفت سے نکلنے کے لئے پے در پے جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

اور آخر وہ خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر جلد ہی ناشتہ کی میز پر سے اٹھ گیا۔

اس کی بہن اور دوسرے کچھ دنوں سے اس میں یہ عجیب سی تبدیلی پا کر بڑے متفکر تھے۔

اس کے جانے کے بعد۔۔۔ سب لوگ ناشتہ سے فارغ ہو کر میز پر سے اٹھنے لگے۔

ثمینہ اپنے کمرے میں چلی آئی کہ ذرا اپنا سامان وغیرہ درست کرنے کے لئے۔

تقریباً گیارہ بجے دوپہر ذوالفقار علی ثمینہ کو لینے چلے آئے۔ وہ سب لوگوں سے مل کر بڑے ہال میں آئی۔ ناجیہ سدیبہ اور صدف بھی اس کے ساتھ تھیں۔

"آپ ابھی تو یہاں رہیں گی نا!" ثمینہ نے ناجیہ کو مخاطب کیا۔

"نہیں ہم لوگ بھی چلے جا رہے ہیں آج شام کو۔" ناجیہ نے جواب دیا

اوہ! میں نے سوچا تھا کہ اگر آپ کچھ روز یہاں ہیں تو کسی دن آپ کو اپنے ہاں لے جاؤں گی۔" ثمینہ نے اداسی سے کہا۔

"میں انشاء اللہ پھر کبھی آئی تو تمہارے پاس ضرور آؤں گی۔"
نجیبہ نے بڑے پیار سے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

ثمینہ کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں لیکن اسے بہت مایوس ہونا پڑا۔ "ارشی مجھے خدا حافظ کہنے بھی نہ آیا۔ آخر میں نے کیا جرم کیا تھا؟ پھر نہ جانے ہم ملیں یا نہ ملیں کون جانتا ہے کیا ہو؟" وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"ارشی تم میرے دل کو یہ انوکھا روگ لگا کر کہاں چھپ گئے ہو؟ میں زندگی کے اس لمبے سفر میں تم کو کہاں ڈھونڈوں گی؟"
اور یہ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں ضبط کے باوجود بھیگ گئیں۔ یہ بات الگ تھی لیکن اس کے دل کا درد کوئی نہ جان سکا۔
"بیٹی! خدا حافظ۔" سیٹھ صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے ثمینہ سے مخاطب ہوئے۔
اور وہ سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے باپ کے برابر کار کی اگلی نشست پر آن بیٹھی۔
اب بھی اس کی نگاہیں ارشی کو تلاش کر رہی تھیں۔
اور آخر اس نے ارشی کو اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا دیکھ لیا۔
ارشی اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی پر ٹیکے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
ثمینہ نے اس کی نگاہوں میں بہت کچھ پا لیا۔ اور اس کے دل سے ارشی

کے لئے چند منٹ پہلے پیدا ہوئے خیال تمام شکایتیں ختم ہو گئیں
اس کی روح ایک انجانی مسرت سے جھوم اٹھی۔
کار گیٹ سے نکل رہی تھی اور راشی پر حسرت نگاہوں سے اسے
جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
اس کا دل جدائی کے زخموں سے چور ہو کر خون کے آنسو رو رہا
تھا۔
کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی لیکن وہ وہیں کھڑا تھا۔
آخر اس نے بڑی بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنا سر کھڑکی کے
پٹ سے ٹکا دیا۔

(۱۲)

ثمینہ کی پر اطمینان زندگی میں ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی — ایک انوکھا درد اس کے دل کا ساتھی بن چکا تھا۔ عندلیب کی شادی کیا ہوئی اس کی زندگی میں انقلاب آگیا۔

"کاش میں شادی میں شرکت نہ کرتی! اور اگر میں گئی بھی تھی تو ارشی یوں میری دنیا میں داخل نہ ہوتا۔ اس نے تو میرا سکون لوٹ لیا۔ ایک آگ سی ہے جو ہر دم میرے دل کو جلائے دیتی ہے۔ ایک تیر سا ہر لمحہ میری روح کو زخمی کئے دیتا ہے۔

یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ یا اللہ! یہ کون سے جرم کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے۔؟ یہ کس جرم کا بدلہ ہے جو مجھ سے لیا جا رہا ہے؟"

ثمینہ عزیب اپنے کمرے میں پڑی ان ہی خیالوں میں کھوئی رہتی۔ وہ پہلے

سے بھی زیادہ خاموش اور تنہائی پسند ہو گئی۔

اس کا کالج کھل چکا تھا اور وہ روزانہ کالج بھی جایا کرتی لیکن اب اس میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی سہیلیوں اور پروفیسروں نے بھی محسوس کیا۔ لیکن اس کا حال دل کسی پر ظاہر نہ ہو سکا۔ اس کی قریبی سہیلی سعدیہ جو کہ ایب کی شادی میں شریک تھی۔ اور ایک موقعہ پر اس نے ارشی کو ثمینہ کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتے پایا تھا۔ کسی حد تک اس کی اس حالت کی وجہ جان چکی تھی۔ کالج میں ثمینہ خاصی شریر مشہور تھی۔ لیکن چھٹیوں کے بعد آئی تو اتنی اداس اور خیالوں میں ڈوبی ہوئی۔ اس کی تمام سہیلیاں اس سے عاجز تھیں۔ ان میں سے کئی شریر لڑکیوں نے تو اس کی اس خاموشی پر اسے چھیڑا لیکن اس نے کسی پر اپنے دلی جذبات ظاہر نہ ہونے دیئے۔

ایک دن ثمینہ اپنی سہیلیوں کے گروہ سے الگ لائبریری میں بیٹھی بظاہر کسی کتاب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے سامنے کتاب کے صفحوں پر اسے کسی کی شاکی نگاہیں نظر آ رہی تھیں۔ اف! یہ آنکھیں مجھے کہیں بھی کسی صورت چین نہیں لینے دیتیں۔

میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ اس نے تھک کر اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن کسی کے ہاتھ کے لمس کو اپنے کندھے پر محسوس کرتے ہوئے اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے سعدیہ تھی۔ ثمینہ کچھ خفیف سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہمیں پاگل کر دو گی تم اپنے ساتھ!

سعدیہ نے اپنے انداز میں خفگی پیدا کرتے ہوئے ثمینہ سے کہا۔
ثمینہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"حد کرتی ہو۔ چپکے سے یہاں کونے میں لگی بیٹھی ہو۔ اور ہم سب تمہیں تلاش کرتے کرتے تنگ آگئیں ———— آخر یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔" سعدیہ اسے چپ دیکھ کر اس پر برس پڑی۔
"کبھی تم لوگ میری خاطر اپنا مزہ کیوں کرکرا کرتی ہو۔ میں تو اپنی بوریت کے خیال سے یہاں آجاتی ہوں۔"
ثمینہ نے جواب دیا۔
"تو تمہاری موجودگی میں ہمیں بوریت کیوں ہونے لگی۔ ؟ یہ خیال تمہیں کیوں کر ہوا ؟"
سعدیہ چڑکر بولی۔
"سہیلیوں میں سے اگر کوئی کسی وجہ سے خاموش ہوتی یا اکیلے رہنا پسند کرے گی۔ تو ظاہر ہے باقی سب اس کی وجہ سے بور ہوں گی۔ اسی لیے میں الگ ہو جاتی ہوں۔"
ثمینہ نے جواز پیش کیا۔
"خیر آج تو تم سے پوچھ کے ہی دم لوں گی کہ آخر تمہاری اس آدم بیزاری کی وجہ کیا ہے ؟"
سعدیہ نے شرارت سے دبی آواز میں اس سے کہا تو ثمینہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔

"دیکھو ثمینہ! مجھے سچ سچ بتادو۔ میں تمہاری سہیلی ہوں بلکہ بہن ہوں مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات نہ چھپانا۔" سعدیہ نے موقع غنیمت جان کر بات شروع کی۔

"کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی۔ تم تو ایسے ہی پیچھے پڑگئی ہو۔" ثمینہ نے بناوٹی غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اچھا تو یہ بات ہے! ثمینہ کی بچی تم مجھ سے چھپاؤ لیکن میں سب جان گئی ہوں۔ اس کے ثبوت میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ تمہارے اس معصوم حسن نے بے چارے ارشی کو بے چین کردیا ہے۔"

سعدیہ نے شرارت سے ہنستے ہوئے ثمینہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانک کر کہہ دیا۔ جس پر ثمینہ قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔ کہ یہ سب اسے کیسے معلوم ہوا۔

"اب بتاؤ یہ کہاں تک جھوٹ ہے؟"

سعدیہ اسے گدگداتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

اس پر ثمینہ کے حسین رخساروں پر شفق سی پھوٹ پڑی اور وہ سعدیہ کی باتوں پر انکار نہ کرسکی۔ ارشی کے ذکر پہ اس کی آنکھیں حیا سے جھکنے لگیں

"اوہو! تم تو یوں شرمارہی ہو۔ جیسے میں نہیں بلکہ تمہارے سامنے ارشی صاحب کھڑے ہوں۔"

سعدیہ نے اس کا خوبصورت چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

توقیر کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ رینگنے لگی ۔

" یہ نزاکت وغیرہ کہاں ہیں ۔"

ثمینہ نے بات کا موضوع بدلنے کے لئے سعدیہ سے پوچھا۔

" شکر ہے کہ تمہیں ان بے چاروں کا بھی ہوش آیا ۔ وہ تو تم سے بہت ناراض ہیں ۔ "

سعدیہ نے جواب دیا ۔

" چلو ان کے پاس چلیں ۔ " ثمینہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور دونوں لائبریری سے نکل کر کینٹین کی طرف چلیں ۔ جہاں دوسری لڑکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں ۔

---

(۱۳)

ارشی کی کیفیت ثمینہ سے بڑھ کر خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جس روز ثمینہ عندلیب کے ہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ اور ناجیہ بھی چلے آئے تھے۔ اس شہر کو چھوڑتے ہوئے اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ جس میں اس کی محبت نے جنم لیا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ آخر وہ بہن کو اکیلے کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ سوائے اس کے ناجیہ کا اس دنیا میں کون تھا۔؟

ارشی اور ناجیہ کے والدین انہیں بہت چھوٹی عمر میں چھوڑ کر اس دنیا سے جا چکے تھے۔ ارشی اس وقت چودہ پندرہ سال کا تھا اور ناجیہ صرف دس برس کی تھی۔

والدین نے ان کے لئے کافی دولت چھوڑی تھی۔ اس لئے ارشد کو

جسے پیار سے سب ارشی کہا کرتے تھے۔ فکر معاش سے آزاد اپنی اور اپنی بہن کی تعلیم کی طرف متوجہ تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے پڑھائی کے علاوہ جائداد کا تمام کام خود سنبھال رکھا تھا۔ اور بڑی ہوشیاری سے ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔

اس وقت اس کی عمر پچیس سال کی تھی۔ اور وہ ایم اے کرنے کے بعد سی۔ ایس۔ پی کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ناجیہ مقامی کالج میں بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ خاندان میں اگر کوئی شادی بیاہ ہوتا تو اس میں دونوں ضرور شرکت کرتے۔ اس کے علاوہ وہ شاذ و نادر ہی رشتہ داروں سے ملتے۔

اس کے دوست اور ناجیہ کی سہیلیاں انہیں بے تحاشہ چاہتے تھے اس لئے انہیں کسی رشتہ دار یا عزیز کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

دونوں کی زندگی بڑے پر سکون انداز میں بسر ہو رہی تھی۔ لیکن اچانک ارشی کی دنیائے دل میں ایک تلاطم سا پیدا ہو گیا۔ اس کا صبر و قرار لٹ گیا۔ کاش میں مدراس نہ جاتا۔

ارشی زیادہ تر انہیں خیالوں میں کھویا رہتا۔ ثمینہ کی طرح اس کی بہن اور دوستوں نے بھی اس کی اس تبدیلی کو تاڑ لیا۔

اور انہیں اس کی وجہ بھی معلوم ہو چکی تھی۔ اس کی اس حالت کے پیش نظر اس کی بہن نے دل میں پورا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ ثمینہ کو ہی اپنی

بھابی بنائے گی۔ اور اس نے امتحانوں کی چھٹیوں میں مدراس جانے کا قطعی
پروگرام بنالیا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ ثمینہ کو اپنے بھائی کی دلہن بنانے
میں ضرور کامیاب ہوگی۔

"میرا بھیا بھی چشم بد دور ہزاروں میں ایک ہے۔ آخر اس میں کمی ہی
کیا ہے۔ جو کسی کو کھٹکے گی۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

ارشی کے دوست عابد اور رضوان جو اس کے ساتھ عندلیب کی شادی
میں موجود تھے۔ اور انہیں ثمینہ کے متعلق ارشی کے خیالات اور دلی جذبات
کا علم تھا۔ اکثر اسے چھیڑتے ———————— لیکن وہ ان کے
جواب میں افسردگی سے مسکرا دیتا۔ انہیں اس کے دل کے اصل روگ
کا علم تو نہیں تھا۔ وہ یہ تو نہیں جانتے تھے کہ ثمینہ کسی اور کی امانت ہے۔ وہ
ایک ایسا پھول ہے جو کسی اور ہی کے چمن کی زینت ہے۔ اس انگوٹھی نے
اور ثمینہ کے الفاظ نے اس کا شک یقین میں تبدیل کر دیا تھا۔

"اُف! میں نے سر بھی پھوڑا تو کس آستانے پر جہاں کسی اور کے
سجدوں کو قبول کر لیا گیا تھا۔ کیا میری قسمت میں اب اپنی ناکام الفت میں
سسکنا ہی رہ گیا ہے۔! کیا خدا کو یہی منظور ہے کہ میں یوں ہی تڑپوں۔" اس
کے دل میں یہ باتیں سوچ سوچ کر دل میں کتنے ہی طوفان اٹھتے رہتے۔

اس نے کئی دفعہ ثمینہ کو بھول جانا چاہا۔ لاکھ کوشش کی کہ اس کا معصوم
چہرہ اس کے تصورات کی دنیا سے مٹ جائے۔ لیکن ہر بار اسے مایوسی ہوئی
ثمینہ کی تصویر اس کے ذہن اور دل پر کچھ اس طرح چھپاں ہوئی کہ مر چکے

کے لیے بھی نہ مٹ سکیں۔

اس خیال سے کہ شاید تنہائی میں ۔ کا خیال ستاتا ہے اس کی یادیں یوں تڑپاتی ہیں۔ ارشی نے خود کو دوستوں میں مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آنے لگا۔ دل کے روگ نے اسے یہاں تک پاگل بنا دیا۔ کہ جوان بہن کا بھی خیال نہ رہا۔ کی محبت نے ناجیہ کی محبت پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔

ناجیہ بے چاری بھائی کی اس بگڑتی حالت پر سوائے کڑھنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ اگر یہی حشر رہا تو بھیا کی صحت ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنی تعلیم اور باقی امور سے بھی بیگانہ ہونے جا رہے تھے۔ آخر کیا ہو گا۔؟" اسے اپنا تو ذرا خیال نہ تھا۔ لیکن بھائی کے لئے اسے بہت دکھ تھا۔ اور وہ کالج بند ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگی۔

اتوار کا دن تھا۔ ناجیہ کو چھٹی تھی۔ وہ کئی دن سے موقعہ کی تلاش میں تھی۔ کہ ارشی سے اپنا ارادہ ظاہر کرے۔ اس نے ابھی تک اس سے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ لیکن آج اس نے ارشی سے بات کرنے کا تہیہ کر ہی لیا۔

"بھیا! مجھے آپ سے ایک بہت بڑی شکایت ہے۔" ناجیہ نے لاڈ سے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس پر ارشی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور دل میں کچھ شرمندہ سا ہوا۔ کہ شاید اس کی اس قدر لاپرواہی کے متعلق ناجیہ اس سے شاکی ہے

قدرے توقف کے بعد اس نے اپنی بہن کی بات کا جواب دیا۔
" میں اپنی منی بہن کی ہر شکایت سننے کو تیار ہوں۔"
آپ ہر وقت اداس اداس سے رہتے ہیں۔ لیکن آپ مجھے اپنے دل کی بات نہیں بتاتے۔ کیا آپ غیر سمجھتے ہیں مجھے۔"
ناجیہ نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔
" نہیں تو! میں کب اداس رہنے لگا ہوں۔ دیکھو تو ہر وقت سیر و تفریح میں رہتا ہوں میں۔"
ارشی نے اپنے آنکھوں کی اداسی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بولا۔
آپ لاکھ چھپائیں بھائی جان! لیکن میں آپ کی بہن ہوں۔ میں آپ کا درد نہ جان سکی۔ تو پھر کون جانے گا۔"
ناجیہ نے شرارت سے ہنس کر کہا۔
لیکن ارشی خاموش رہا۔
" تو کیا ناجیہ اس کا دکھ جانتی ہے۔" وہ سوچ رہا تھا۔
" دیکھئے تو بھیا! گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ اب میں اکیلی نہیں رہ سکتی اس گھر میں۔ اب آپ بھابی لانے کے لئے تیار ہو جائیے۔"
ناجیہ مطلب کی طرف بڑھ رہی تھی۔
" کیسی باتیں کرتی ہو ناجیہ!"
وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کا گلا رندھا ہوا تھا ——— وہ آگے

کچھ بھی نہ کہہ سکا۔
میں اب کچھ بھی نہیں سن سکتی بھیا!
میں نے ایک بہت پیاری سی لڑکی کو اپنی بھابی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
"یہ اب کبھی نہ ہو سکے گا ناجو! یہ ناممکن ہے۔"
ارشی نے بڑے مایوسانہ انداز میں کہا۔
"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔"
ناجیہ حیران سی بھائی کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید ارشی کسی اور لڑکی کے متعلق سمجھا ہے۔ اس لئے وہ اس کی غلط فہمی مٹانے کو بولی۔
"میں ثمینہ کو اپنی بھابی بنا کر رہوں گی۔ آپ کو ماننا پڑے گا بھیا!"
بہن کے منہ سے ثمینہ کا نام سن کر وہ تڑپ اٹھا۔
"کس کے متعلق سوچ رہی ہو پگلی!"
وہ دکھ بھرے انداز میں بولا۔
"کیوں بھائی جان!
ناجیہ کی شربتی آنکھیں بھائی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مارے حیرت کے پھیل گئیں۔ جیسے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو اس نے۔
وہ سوالیہ نظروں سے متواتر بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"وہ کسی اور کی ہونے والی ہے! وہ میرے مقدر میں کہاں۔؟

ارشی کا لہجہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہے ؟"

ناجیہ اور بھی حیران ہوئی۔ اور پوچھنے لگی اس پر ارشی نے انگوٹھی والی بات اسے بتادی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ انگشتری اس کی اپنی ہو۔" ناجیہ نے بھائی کا شبہ مٹانے کے لئے جواز پیش کیا۔

لیکن ارشی کے سامنے ثمینہ کا دغصیلا چہرہ تھا۔ اور اس کے کانوں میں اس کے الفاظ گونج اٹھے۔ جو اس نے انگوٹھی لیتے وقت کہے تھے۔

"نہیں ناجیہ! اس نے اس کا ثبوت دے دیا تھا۔" ارشی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"پھر بھی بھیا! " میرا ارادہ ہے کہ میں کالج میں امتحانوں کی چھٹیاں ہوتے ہی مدراس جاؤں اور چچی ثمینہ کے ذریعہ لبیبہ کی خواستگار کروں۔

ناجیہ نے اپنے فیصلہ پر قایم رہتے ہوئے کہا۔

"تم خواہ مخواہ سر پٹک رہی ہو۔ اس کا نتیجہ تو کچھ نہیں ہوگا ارشی نے دکھی آواز میں کہا۔ تو ناجیہ بھائی کی اس بات پر قدرے متفکر سی ہوگئی۔

" آپ کیوں اتنے مایوس ہوتے ہیں بھیا! انشاءاللہ ضرور کوئی بہتر صورت پیدا ہوگی۔ "

ناجیہ نے اسے تسلی دی۔

"تمہاری مرضی! اپنی تسلی کے لئے کر دیکھو۔"

ارشی صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اور ناجیہ اپنے اتنے پیارے بھائی کے دکھ کا حل سوچنے لگی۔

— — — — —

(۱۴)

ثمینہ کا کالج موسم گرما کی تعطیلات کے لئے تین ماہ کے لیئے بند ہوگیا۔ اور وہ کچھ اور بھی اداس رہنے لگی۔ اب تو اس کی یہ خاموشی اس کے والد کو بھی محسوس ہوئی ۔ وہ اپنی بیٹی کو یوں پژمردہ کیسے دیکھ سکتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے اپنی زیادہ تر توجہ اس کی طرف مرکوز کردی۔ کبھی اسے کسی سہیلی کے ہاں بھیج دیتے یا باہر سیر کرنے کے لئے لے جاتے۔ انہیں ڈر تھا کہ ان کی زندگی کا یہ واحد سہارا کہیں ان سے چھن نہ جائے ۔

وہ شروع گرمیوں میں ہی بیٹی کو شملہ بھیج دیا کرتے تھے ۔ جہاں ان کی ذاتی کوٹھی ایک بہت پر فضا اور حسین مقام پر واقع تھی ۔ صرف چند دن خود ٹھہرتے اور جب ثمینہ کی کوئی سہیلی اس کے بلانے پر اس کے پاس آجاتی۔ تو وہ واپس چلے آتے ۔ لیکن اس دفعہ انہیں اپنی چھوٹی بہن کا انتظار

تھا۔ جس نے اس سال موسم گرما میں آنے کے متعلق لکھا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ گرمی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ بے چاری ثمینہ اس غضب کی گرمی میں رہنے کی عادی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اسے اپنی پھوپھی کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ اس سال تو وہ شملہ جلد جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کا ارشی آباد تھا۔ ایک موہوم سی امید پر کہ شائد اسے ارشی کہیں نظر آجائے۔ وہ اڑکر شملہ پہونچ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اسی مرتبہ اتنی دیر ہوئی جاتی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر رونا آرہا تھا۔ باپ سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ کہ شملہ چلے چلیں اور پھوپھی جان کو بعد میں لے جائیں گے۔

آخر ایک دن خدا نے اس کی دعا سن ہی لی اور ذوالفقار علی نے خود ہی یہ تجویز اس کے سامنے پیش کی۔

"کس قدر گرمی پڑ رہی ہے بیٹی! " میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اور تمہاری آیا ماں کو چھوڑ آؤں۔ جب آصفہ آئے گی۔ تو اسے وہیں لے آؤں گا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری صحت گرمی میں خراب ہو جائے۔"

ذوالفقار علی نے اس کے زرد ہوتے ہوئے رخساروں پر اپنی متفکر سی نگاہیں ڈالتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

پھوپھی جان کو آلینے دیں ابو! کوئی بات نہیں۔ انسان کو ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کا عادی بننا چاہیئے۔"

ثمینہ نے باپ کی بات کا جواب دیا۔

"میں تمہارے خیالات سے بہت خوش ہوں بیٹی! لیکن میں

یہی چاہتا ہوں کہ تم خیر سے چلی ہی جاؤ ــــــــ پہلے ہی کافی دن گذر گئے ہیں۔

ملازمین بے چارے بھی روز انتظار کرتے ہیں۔ روزانہ ان کا فون آتا ہے۔ کہ ہم لوگ کس دن آرہے ہیں۔ نامعلوم آصفہ کب آئے۔ میں آج ہی تار دیتا ہوں۔"

ذوالفقار علی بیٹی کے سلجھے ہوئے خیالات سے خوش ہوتے ہوئے بولے۔

باپ کے منہ سے جانے کے متعلق سن کر تمینہ کا رواں رواں خوشی سے مسکرا اٹھا۔ لیکن وہ اپنی خوشی ضبط کئے بیٹھی رہی۔

"تو آج ہی چلنے کی تیاری کر لینا۔ ہم لوگ انشاء اللہ کل صبح کے جہاز سے روانہ ہوں گے۔ میں ابھی سیٹیں ریزرو کرا کے ٹکٹ خرید لیتا ہوں۔ اور فون پر اطلاع دوں گا۔ کہ ہم لوگ کل آرہے ہیں۔"

ذوالفقار علی نے پروگرام مرتب کیا۔ اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تمینہ خوشی خوشی اپنے کمرے میں گئی اور آیا جی کے ساتھ مل کر رخصت سفر تیار کرنے لگی۔

ایک انجانی خوشی تھی۔ جو اس کی روح کو سکون سے ہمکنار کر رہی تھی۔ محبوب کے شہر جانے کے خیال ہی سے اسے ایک عجیب مسرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی یہ حالت بوڑھی آیا سے چھپی نہ رہ سکی۔ آخر

یہ لوگ پہلے بھی تو شملہ جایا کرتے تھے۔ لیکن جو خوشی اس مرتبہ ثمینہ کے چہرہ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ حیران سی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

آج ثمینہ آپا جی کو بازار بھی لے کر گئی۔ جہاں سے کچھ ضروری سامان وغیرہ خریدا۔ اور واپسی پر صدف سے ملنے قصر شہاب بھی گئی۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ ناجیہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں مدراس آرہی ہے۔

یہ سن کر اس کا دل ڈوب سا گیا۔ ہر قدم پر تقدیر اس سے مذاق پر آمادہ تھی۔ یہ کیا ہوا میں ادھر جاؤں گی۔ اور ارشی بھی ضرور ناجیہ کے ساتھ ہوگا۔ ضرور وہ امتحانوں کی چھٹیاں یہیں گذارے گا

" اور یہ سب باتیں سوچ کر وہ خاموش سی ہوگئی۔ ناجیہ نے ابھی اپنے ضروری کام کے متعلق ان لوگوں کو نہیں لکھا تھا۔ ورنہ صدف اسے ضرور چھیڑتی۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ثمینہ واپس آگئی۔

" میری ہر خوشی اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔ میری تمنائیں اتنی جلد کیوں دم توڑ دیتی ہیں۔ آخر تقدیر مجھ سے روٹھ کیوں گئی ہے۔"

ثمینہ باقی تمام دن یہ سوچتی رہی اور بے دلی سے آنے والے دن کا انتظار کرنے لگی۔ جس کا اسے پہلے بڑی شدت سے انتظار تھا۔

— — — — — —

(۱۵)

شملہ کی شہری آبادی سے ہٹ کر ایک خوبصورت وادی، قرب وجوار میں زمرد کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں ذوالفقار کی عالی شان کوٹھی ایک پہاڑی پر واقع تھی۔

کوٹھی تک پہنچنے کے لئے سنگ مرمر کی خوبصورت سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ اور کار کے لئے خوبصورت سا ڈرائیو، ڈھلوان کی صورت میں کوٹھی کے اوپر تک چلا گیا تھا۔ جو گیرج میں ختم ہوتا تھا۔

کوٹھی کے اردگرد ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جس میں پھلوں کے بے شمار درخت تھے۔ سیب، خوبانی اور بادام کے درخت تو کثرت سے تھے۔ ان میں پھول آئے ہوئے تھے۔ جن کی خوشبو سے فضا میں ایک پر کیف سا نشیلا ماحول پیدا ہو رہا تھا۔

پھولوں کی اس قدر بہتات تھی۔ کہ روشوں پر بھی جا بجا پھول ہی پھول بچھ گئے تھے۔ کوٹھی کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی خوشنما جھیل تھی۔ جس کے گرد چیل اور چنار کے دیو قامت درخت پہرے داروں کی طرح ایستادہ تھے۔ پانی میں کنول کے پھول تیرتے رہتے۔ غرض یہ مقام اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔

وادی میں ذوالفقار علی کی بڑی عزت تھی۔ یہاں کے غریب لوگ ثمینہ کو کنول رانی کہتے تھے۔

اسے کنول کے پھول اس قدر پسند تھے۔ کہ سب چھوٹے بڑے اسے کنول رانی ہی کہنے لگے۔

دونوں باپ بیٹے ان غریب لوگوں کے لئے اپنے ساتھ گرم کپڑے اور دوسری بہت سی چیزیں لاتے جن سے انہیں کافی مدد پہونچ جاتی۔ اور اسی لئے سب دونوں پر جانیں تک قربان کرنے کو تیار رہتے۔ ثمینہ کا بچپن بھی ان لوگوں میں بیتا تھا۔ وہ شروع سے موسم گرما یہاں گذارا کرتی تھی اسی لئے یہاں کے لوگوں سے بخوبی ہو چکی تھی۔ کئی لڑکیاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ اور ثمینہ کو بہت پیار کرتیں۔ ہر سال گرمی آنے کا انہیں شدت سے انتظار رہتا۔ اور جب ثمینہ آتی تو جیسے وادی میں ان کے لئے بہار آجاتی۔ ثمینہ کا وقت ان پر خلوص لوگوں میں بہت خوشی سے کٹ جاتا۔ ذوالفقار علی بھی اسی لئے بے فکری سے لاہور میں اپنے کام میں مصروف رہتے اور ثمینہ کے وہاں رہنے کے دوران دو تین دفعہ چکر لگا جاتے۔ اس مرتبہ بھی وہ ثمینہ

کو چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے یہاں بھی دنیا کے ہر آرام کا خیال کر رکھا تھا۔ اور ملازمین کو خاص ہدایت تھی کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

ثمینہ کو ویسے تو اپنی ساری کوٹھی پسند تھی۔ لیکن اس کا جھیل والا حصہ تو اسے بے حد پسند تھا۔ وہ گھنٹوں سیب کے گھنے درختوں تلے جھیل کے شفاف اور ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی رہتی۔ اور جب اسے سردی کا احساس ہوتا تو پانی سے پاؤں نکال کر شانوں پر پڑی شال کو اپنے گرد لپیٹ کر جھیل کے کنارے ٹہلنا شروع کر دیتی۔ سیب کے سفید پھول جھیل کے کنارے پر اگی گھاس میں فرش بنا دیتے۔ اور یہ منظر ثمینہ کو بہت بھلا معلوم ہوتا۔

کنول کے حسین پھول خاموشی سے کچھ کچھ فاصلہ پر پانی میں تیرتے رہتے وہ ان پھولوں پر نگاہیں جمائے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی کہ اتنے میں کوئی اسے آکر چونکا دیتا۔

"چلئے کنول رانی! آیاں ماں آپ کو بلا رہی ہیں۔ اور وہ اندر چلی آتی ان دنوں زندگی کتنی پیاری ہو جاتی۔ لیکن اس بار تو وادی کا تمام حسن اس کی نظروں میں ماند پڑ گیا تھا۔

یہ چمن کی خوبصورتی۔ جھیل کا کنارا۔ اور سیبوں کے درختوں کی گھنی چھاؤں سب ہی تو اپنا حسن کھو چکے تھے۔ وہ بڑی بے دلی سے جھیل کے کنارے بیٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی آتی اور جب یہاں بھی اس کا جی نہ لگتا

تو میں ٹہلنا شروع کر دیتی یا باہر نکل کر اکیلی دور دور تک نکل جاتی۔ وادی میں سب ہی تو اسے جانتے تھے کس میں ہمت تھی کہ کنول رانی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔

آپا ماں اور اس کی سہیلیاں اسے یوں اداس دیکھ کر حیران تھیں۔

وہ پہلے والی بات کنول رانی میں ختم ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی بڑے خلوص سے اپنی ان دیہاتی سہیلیوں سے ملتی۔ لیکن اس کی طبیعت میں وہ شوخی نہ تھی۔

"کیا ہم سے ناراض ہو کنول؟"

اس کی ایک خوبرو سہیلی عنبر نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو!"

نیلمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم یوں اداس کیوں ہو۔"

گلبن نے اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی ایسی کوئی بات نہیں۔ میری طبیعت کچھ دنوں سے خراب تھی۔ اب ہوا بدلی ہے تو پھر ویسی ہو جاؤں گی۔"

اس نے انہیں ٹالنے کی غرض سے جھوٹ بولا۔

اس کے شب و روز اسی امید میں گزر رہے تھے کہ شاید کبھی ارشی ادھر آ نکلے اسی لئے وہ صبح و شام گھر سے کافی دور سیر کے لئے نکل جاتی

لیکن ہر دفعہ ناکام لوٹنا پڑتا۔

بعض اوقات تو وہ اپنی اس آرزو کو پاگل پن سمجھ کر دماغ سے نکالنا چاہتی۔ لیکن اس کی تمنا بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"آہ! میں تمہارے شہر میں ہوں ارشی! لیکن تم اتنے بیگانہ ہو — تمہیں معلوم ہی نہیں ——— کہ کوئی تمہاری یادوں کے سہارے جی رہا ہے۔ تمہیں دیکھنے کی تمنا میں صبح و شام سرگرداں ہے — سنتے آئے تھے کہ پیار اگر سچا ہو تو چاہنے والے ضرور ملتے ہیں۔" نہ جانے میں تمہیں یاد بھی ہوں۔ یا تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ میں تمہارے خیالوں کو بھی پوجتی ہوں۔ اور پوجتی رہوں گی ارشی!"

تم آؤ یا نہ آؤ لیکن تمہاری یاد میرے دل میں سدا درد بن کے سمائی رہے گی۔

خدا کے لئے کبھی ادھر چلے آؤ۔ تم ہی بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ کہاں تلاش کروں؟ وہ یہ سوچتے سوچتے رو پڑی۔ آنسوؤں کے قطرے جھیل کے پانی میں ملتے رہے۔ اور شام گہری ہونے لگی۔

اور وہ پلکوں میں آنسوؤں کی نمی چھپائے کمرے میں آگئی۔

(۱۶)

نیلمہ اکثر شام کی چائے کے بعد تنہا یا اپنی کسی سہیلی کے ساتھ وادیٔ زمرد کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے دور دور تک نکل جاتی۔ حسبِ معمول آج بھی وہ اکیلی ہی چل دی۔ ہلکے سبز رنگ کی بنارسی کی ساڑھی باندھے اور پشمینے کی شال کندھوں پہ ڈالے وہ بڑے پروقار انداز میں چل رہی تھی۔ راہ چلتے اکا دکا مسافر ایک لمحہ کے لئے رک کر اسے دیکھنے لگتے۔ وہ ان سے بے خبر اپنے ہی خیالوں کی دنیا میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی رہائش گاہ سے کافی دور ایک خوبصورت پہاڑی تھی۔ جس کے دامن میں ایک شفاف ندی بہتی تھی۔ دور دور تک چیل اور بادام کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ جن کے نیچے اور تنوں کے گرد خودرو پھولوں کی بیلیں اتنی بہتات میں تھیں کہ وہاں سے گزرنا

دشوار تھا۔ جنگلی گلاب کی مہک ہر طرف رچی تھی۔ یہاں ثمینہ کو بہت سکون میسر آتا تھا۔

وہ کتنی کتنی دیر اس پہاڑی پر چڑھ کر بیٹھی رہتی اور نیچے بہتی ندیا کے پانی میں لکریاں پھینکا کرتی۔ آج بھی اسی طرف جا رہی تھی۔ روپہلی دھوپ کافی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ ہر سو سکون ہی سکون تھا۔ وہ پہاڑی کے قریب ہی پہونچی تھی۔ کہ دادی کا کم سن چرواہا جو اکثر اسی طرف بکریاں چرانے آیا کرتا تھا۔ اور ثمینہ سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔ اسے اپنی طرف گھبراہٹ سے دوڑتا دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے راجو؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ وہ چرواہے سے پوچھ رہی تھی۔

"کنول رانی! آپ اس طرف نہ جائیے گا۔ وہاں کوئی آدمی زخمی حالت میں پڑا ہے۔ آپ یہیں میری بکریوں کے پاس ٹھہرئیے۔ میں بستی سے آدمیوں کو لے کر آتا ہوں۔"

راجو نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اسے ہدایت کی۔ اور وہ تیزی سے بھاگتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ثمینہ کچھ دیر تو حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر حواس پر قابو پا کر وہ اس کے منع کرنے کے باوجود پہاڑی کی سمت بڑھی۔

" نہ جانے بے چارا کون ہے۔؟ اور اس پر کیا بیتی ہے۔ اسے

دیکھنا چاہیئے۔ کس حالت میں ہے !"

تھینہ یہ سوچتی ہوئی پہاڑی کے پاس پہونچ گئی۔

کوئی اوندھے منہ پہاڑی کے ڈھلوان پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے قریب ایک بڑا سا پتھر بھی تھا۔ اور کچھ خون نکل نکل کر زمین پر جم چکا تھا۔ اس کا امیرانہ لباس اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے سے متعلق ہے۔ تھینہ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ ایک منٹ تک تو اس کے قریب کھڑی رہی۔ شرم تو مالغ تھی اس لئے اسے ہاتھ لگاتے ہوئے قدرے جھجھک رہی تھی۔ لیکن انسانی ہمدردی اس کی نسوانی حیا پر غالب آگئی۔ اور وہ اس کی طرف بڑھی۔ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا منہ اپنی طرف کرنے لگی تاکہ اس کے دل کی دھڑکن دیکھ سکے۔ لیکن اس کا اپنا دل ایک دم سے دھڑک اٹھا۔ اور اس کی دھڑکن ڈوبنے لگی۔

" اف میرے مالک ! یہ کیا ہوگیا ؟ "

وہ نوجوان کو پہچانتے ہوئے اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ وہ ارشی تھا اس کا اپنا ارشی۔ جسے وہ صبح و شام تلاش کر رہی تھی۔ اور آج وہ اس حالت میں اسے ملا گیا تھا۔

" ارشی ! مجھے ملنا بھی تھا تو اس حالت میں ! "

وہ اس کے بالکل قریب تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور ہر بات سے لاپرواہ وہ اس کے سینہ پر جھک گئی۔ اس کا دل

بہت سست رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ ثمینہ نے اس کے خوب صورت بال ہٹا کر اس کا زخم دیکھا جو کافی گہرا تھا۔ خون سے اس کے بال نچڑ رہے تھے۔ اور قمیص بھیگ چکی تھی۔ وہ بالکل بے ہوش تھا پائنس پڑے ہوئے کیمرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان حسین مناظر کو کیمرے میں جذب کرنے آیا تھا۔

ثمینہ کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں وہ اس نازک موقعہ پر اکیلی کیا کر سکتی تھی۔ آخر اسے خیال آیا کہ اس کے منہ میں پانی ٹپکایا جائے۔ تاکہ اسے کچھ ہوش آئے۔ اس خیال سے وہ نیچے اتری اور اپنا رومال پانی سے تر کر کے لے آئی۔ اس کا منہ کھول کر دوسرے ہاتھ سے پانی اس میں نچوڑنے لگی ـــــ لیکن ارشی نے آنکھیں نہ کھولیں۔

ثمینہ نے اس کا سر اپنی شال میں اچھی طرح لپیٹ دیا تھا اور اسے اپنے زانو پر رکھے وہ حسرت اور پیار بھری نگاہوں سے اس کے چہرہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

اگر ارشی کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ ثمینہ دل ہی دل میں سوچ کر روتے ہوئے اپنے خدا سے اس کی زندگی کی دعا مانگ رہی تھی۔

ارشی کا چہرہ ثمینہ کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں سے بھیگتا گیا۔

"ابھی تک راجو کسی کو بھی لے کر نہیں آیا۔ یا اللہ کیا ہوگا؟"

وہ ملتجیانہ نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گڑگڑائی۔
کچھ دور سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ راجو لوگوں کو لئے
آگیا۔
ثمینہ کو اس کے اتنے قریب بیٹھے دیکھ کر یہ لوگ تیز تیز قدموں
سے آگے بڑھے۔ انہیں آتا دیکھ کر اس نے اپنی آنکھیں ساڑھی کے
آنچل سے خشک کیں۔
"بچا! انہیں کوٹھی پہنچا دیں۔ بہت سخت زخمی ہو گئے ہیں۔
ثمینہ نے ایک معمر شخص کو ادب سے مخاطب کرتے ہوئے
ارشی کی طرف اشارہ کیا۔
نہ جانے بے چارہ کون ہے؟ وہی شخص ارشی کی طرف بڑھا
اور پھر ان تینوں نے مل کر اسے اٹھا لیا۔ اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے
ثمینہ بھی لڑکھڑاتے قدموں سے ان کے ساتھ چل دی۔ وہ چاہتی تھی جلد
سے جلد گھر پہونچ کر ڈاکٹر کو بلائے۔ اور کسی روحانی طاقت سے وہ
نہ جانے اتنی جلدی کیسے کوٹھی پہونچ گئی۔ اس کا ارشی اس سے کافی
فاصلے پر کس حالت میں اس کے گھر لایا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر اس
کی روح بے چین ہو رہی تھی۔
اس نے گھر پہونچتے ہی ڈاکٹر کو فون کیا جس نے جلد چلے آنے کا
وعدہ کیا۔ اور ثمینہ نے آپا جی کو مختصر الفاظ میں ساری بات بتادی
وہ بے چاری بھی حیران سی ارشی کے لئے بستر ٹھیک کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد ارشی کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ تمام ملازمین اور دوسرے لوگ کوٹھی میں جمع ہو گئے۔ لیکن تمینہ نے انہیں سختی سے کسی طرح ٹال دیا۔ اور وہ چلے گئے۔

ڈاکٹر آچکا تھا۔ اور تمینہ سہمی ہوئی سی اس کے ساتھ ارشی کے کمرہ میں پہونچی۔ ڈاکٹر بڑے غور و فکر سے اس کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے ارشی کے زخموں کی ڈریسنگ کی۔ اور اسے ہوش میں لانے کے لئے انجکشن لگا دیا۔

"ان کے دماغ پر کافی گہرا اثر ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آج رات تک ہوش میں آجائیں گے۔

انہیں بہت زیادہ توجہ سے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ اگر ان کو وقت تک ہوش نہ آئے تو مجھے پھر بلوا لیجئے گا۔ ڈاکٹر نے تمینہ کو ضروری ہدایات دیں۔ اور پینے کے لئے خوراک بھیجنے کا کہہ کر رخصت ہوا۔ تمینہ بستر کے بالکل قریب ایک کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔

ارشی کی نبض پر اپنی نازک انگلیاں رکھے وہ اس کے زرد چہرہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت تمینہ کو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا۔ روتے روتے اس کا برا حال ہو گیا۔ اور آخر تھک کر اس نے اپنا سر پلنگ پر ٹیک دیا۔

(۱۷)

ارشی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ ثمینہ اس کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

شاید ابھی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اور وہ اسی عالم میں پڑا تھا۔ ثمینہ کا دل ہر لمحہ ڈوب رہا تھا۔ وہ غمناک اور خوفزدہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس دوران آپا جی کئی دفعہ کمرہ میں آئیں۔ لیکن ثمینہ کچھ ایسی گم سم بیٹھی تھی۔ کہ ان کے آنے کی خبر نہ ہو سکی۔ آپا حیران تھی کہ ثمینہ کو اس اجنبی نوجوان کی اس حالت کا افسوس اس قدر کیوں ہے۔ اور آخر وہ اس بات کو ثمینہ کا جذبہ ہمدردی سمجھ کر خاموش ہو گئیں۔

"ڈاکٹر کو اطلاع کر دینی چاہیئے کہ یہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"

ثمینہ یہ سوچ کر اٹھی ۔ اور ڈاکٹر کو فون کرنے چلدی ۔ وہ دوسرے کمرے سے فون نمبر ملا رہی تھی ۔ کہ باہر کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا ۔ اور وہ فون کر کے برآمدے میں نکل آئی ۔ ذوالفقار علی ہاتھ میں اٹیچی تھامے برآمدے کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے ۔

باپ کی غیر متوقع آمد پر وہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساسات لئے ان کی طرف لپکی ۔

" آداب ابو جان ! "

ثمینہ باپ کے ہاتھ سے اٹیچی پکڑتے ہوئے بولی ۔

" جیتی رہو میری بچی ۔ میں تمہارے لئے کتنا اداس ہو گیا تھا ۔ "

ذوالفقار اس کے بالوں پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے ۔

ان کی آمد کے متعلق سن کر تمام ملازمین ان کے گرد جمع ہو گئے ۔ اور ان کے سلام کا جواب دیتے ذوالفقار علی اپنے کمرے میں آگئے ۔

" اور تو سب خیریت ہے نا بیٹی ؟ "

وہ ثمینہ کے زرد چہرہ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے ۔

" جی ! ابو حضور ! لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ثمینہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ۔

" ہاں ! ہاں ! بیٹی کہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ذوالفقار علی اس کے کندھے کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے پوچھنے

گے ۔۔۔۔ !"

اور باپ کے استفسار پر نفیسہ نے انہیں تمام واقعہ بتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ لڑکا عندلیب کا رشتہ کا بھائی ہے۔ وہ اور اس کی بہن عندلیب کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ وہاں یہ لڑکا بھی موجود تھا۔

ذوالفقار علی یہ پریشان کن خبر سن کر بہت فکر مند ہوئے۔ اور نفیسہ کے ہمراہ اس کمرہ میں آئے جہاں ارشی سفید بستر پر زندگی و موت کی کشمکش میں پڑا تھا۔

وہ اس کے اوپر جھکے اس کی نبض دیکھ رہے تھے۔

اس بے چارے کو تیز بخار بھی ہے۔ اور دل کی دھڑکن بہت سست ہے۔

"کون سے ڈاکٹر کو دکھایا ہے بیٹی؟ وہ نفیسہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

ڈاکٹر رحمان آئے تھے۔ انہوں نے تو انجکشن بھی دیا تھا۔ اور یہ دوائیاں بھی۔

اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کے متعلق بتایا۔

ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر رحمان کمرے میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر ذوالفقار کو دیکھ کر انہیں سلام کیا

"کیسا حال ہے ان کا؟"

وہ ارشی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ رہے تھے

"ابھی تک تو کوئی افاقہ نہیں ۔"

تہمینہ نے جواب دیا ۔

"میں ابھی ابھی مدراس سے آ رہا ہوں ۔ یہاں آ کر اس حادثہ کے متعلق معلوم ہوا ۔

ذوالفقار علی کہہ رہے تھے ۔

"آپ کے عزیز ہیں ؟"

ڈاکٹر رحمان پوچھنے لگے ۔

"جی ہاں !"

ذوالفقار علی نے جواب دیا ۔

"یہ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئے ۔ آپ کا کیا خیال ہے"

ڈاکٹر رحمان اس کا معائنہ کرنے کے بعد ذوالفقار علی سے مخاطب ہوئے ۔

اور انہوں نے بھی مایوسی سے سر ہلا دیا ۔ تہمینہ بغور ان کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اور ایسی باتیں سن کر وہ روہانسی ہو گئی — یارائے ضبط نہ رہا ۔ تو وہ جلدی سے ساتھ والے کمرے میں چلی گئی ۔ جہاں اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ۔ اور وہ پردے کے پیچھے سے دیکھنے لگی ۔

آپ پریشان نہ ہوں ۔ میں ٹیکہ ڈبل ڈوز دے رہا ہوں ۔ پوری امید ہے یہ ایک گھنٹہ کے اندر ہوش میں ہوں گے ۔"

ڈاکٹر رحمان نے ذوالفقار کے متفکر چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں تسلی بخش دی اور دوسرا انجکشن لگا دیا۔

ڈاکٹر رحمان کچھ دیر ٹیکے کا ردعمل دیکھتا رہا۔ اور اسے تسلی ہوگئی تو وہ جانے کے لئے اٹھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب میرے آنے کی ضرورت تو نہیں۔ آپ خود جو موجود ہیں۔

ڈاکٹر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"اللہ کرے اسے ہوش آجائے۔"

ذوالفقار علی نے ارشی کے خوبصورت لیکن زرد چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر رحمان یہ کہتے ہوئے کمرہ سے نکل آیا۔

ثمینہ دوسرے کمرہ میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے دل کو قدرے اطمنان ہوا۔ اور وہ باپ کے پاس آگئی۔

ذوالفقار علی بیٹی کے دلی جذبات سے ناواقف تھے۔ اور ارشی کے لئے اس کی یہ پریشانی انہوں نے انسانی ہمدردی کی نگاہ سے دیکھی اور یہ سوچ کر بہت خوش تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ ان کے سامنے بے ہوش پڑا یہ نوجوان ایک اجنبی انسان ہی نہیں۔ بلکہ ان کی بیٹی کے دل کا مالک بھی بن چکا ہے۔

وہ خاموشی سے ارشی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کمرہ میں مکمل سکوت چھایا تھا۔ آخر ذوالفقار علی نے خاموشی کو توڑا۔

"اس کے گھر والوں کو کیسے معلوم ہوگا۔"

وہ پوچھ رہے تھے۔

"ابو جان! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ کہ ناجیہ کو کس طرح اطلاع دوں۔ پتہ بھی نہیں معلوم۔"

ثمینہ نے پریشانی سے کہا۔

"ابھی یہ ہوش میں آجائے تو پوچھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تو کوئی ذریعہ نہیں۔ یا پھر سیٹھ شہاب کو فون کر دیں۔"

ذوالفقار نے عندیہ ظاہر کیا۔

وہ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ ایک گھنٹہ تک دیکھ لیتے ہیں۔ پھر یہی ذریعہ اختیار کرنا ہوگا۔

ثمینہ نے مشورہ دیا۔

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے!"

ذوالفقار نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔

"ابو! آپ کھانا کھائیں۔ آپ تھکے ہوئے بھی ہوں گے۔ اس وقت آرام کریں۔"

ثمینہ نے باپ سے کہا۔

"نہیں بیٹی! مجھے بھوک نہیں۔"

ذوالفقار نے کہا۔

"کچھ ہی کھالو ابو!" ثمینہ نے منت کہا۔

"تم نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں؟"

ذوالفقار نگاہ شفقت سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں ابو! میں نے شام کی چائے کے ساتھ کافی پھل وغیرہ کھا لیئے تھے۔ اس لئے اس وقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔"

ثمینہ نے باپ کی تسلی کے لئے جھوٹ بولا۔

"اچھا ٹھہر کر کھانا ضرور کھا لینا۔"

ذوالفقار نے تاکید کی۔

"بہت بہتر ابو حضور!"

ثمینہ نے جواب دیا۔

اتنے میں آیا جی نے کھانا تیار ہونے کے متعلق بتایا تو ذوالفقار ثمینہ کے زور دینے پر کھانے کے لئے چلے گئے۔ اور ثمینہ جو تنہائی کی منتظر تھی ارشی کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور اس کے زرد چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔

- - - - -

(۱۸)

"پانی!
ارشی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اور آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔
اسے ہوش میں دیکھ کر ثمینہ کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔
وہ جلدی سے میز پر پڑے گلاس میں سے پھلوں کا رس چمچے کے ساتھ اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔
اس دوران ارشی اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ بخار کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
"میں کہاں ہوں۔"
ارشی نے اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوئے ثمینہ سے پوچھا۔

"آپ اپنے گھر میں ہیں!"
ثمینہ جو ارشی کو ہوش میں پا کر اس سے شرمائی جا رہی تھی کہنے لگی۔
"میرا گھر؟ اور تم.......تم تو......آہ!"
ارشی اب بھی اسے بغور دیکھتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
اس کی زبان سے ایسی باتیں سن کر ثمینہ کو بہت دکھ ہوا۔
شائد ارشی ابھی تک غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔
"تو میں یہاں کیسے آ گیا ہوں۔"
ارشی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"آپ اٹھئے نہیں! میں ابھی آپ کو بتاتی ہوں۔"
ثمینہ کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کے کندھے پر ٹک گیا۔
آہ! اس نے درد کی شدت سے بے چین ہو کر اپنا سر واپس تکیہ پر ڈال دیا۔
"تم تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں! "نفرت کرتی ہو نہ مجھ سے؟"
ارشی ثمینہ کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ اداسیوں میں ڈوب چکا تھا۔
شائد ابھی اسے پوری طرح ہوش نہ آیا تھا۔ اور وہ اسی عالم میں اپنے دلی جذبات بغیر سمجھے کہے جا رہا تھا۔
ثمینہ اس کے اس انداز پر گھبرا گئی۔ اگر ابا جان یا کوئی اس طرف آ گیا تو کیا ہو گا؟" اور اس سے وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے!"
ثمینہ گھبرائے ہوئے انداز میں التجا کر رہی تھی۔
اس کے اس انداز پہ ارشی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔
"اوہ! معاف کرنا ثمینہ! میں ہوش میں نہیں تھا۔"
ارشی ندامت سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کس خیال سے بھر آئیں۔
"آپ روئیے نہیں! یہ آپ کے لئے مضر ہے۔"
اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھی۔
"کیا مجھے اپنے نصیبوں کی سیاہی آنسوؤں سے بھی نہ دھونے دو گی ثمینہ؟"
ارشی اب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ اور ثمینہ کے کہنے پر بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"یوں نہ کہئے" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔
"تم بہت ظالم ہو ثمینہ! کسی کا دل زخمی کر کے اسے یہ کہنا کہ تڑپو نہیں۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟"
ارشی کے منہ سے ضبط کے باوجود ایسے الفاظ نکل رہے تھے۔ جو ثمینہ کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو رہے تھے۔
اس کی یہ کیفیت ارشی سے چھپی نہ رہ سکی۔
"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" ثمینہ نے پل بھر کو اپنی پلکیں

اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ثمینہ! لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہاں کیوں لائیں۔ وہیں پڑے پڑے مر جانے دیا ہوتا تو اچھا تھا"

ارشی نے غمگین آواز میں بڑے کرب سے پوچھا۔

"آپ کے لیے زیادہ باتیں کرنا اچھا نہیں!" اس لئے آپ آرام کریں۔ میں ابو جان کو بلا کے لاتی ہوں۔ وہ بھی آپ کے لئے بہت پریشان ہیں۔"

ثمینہ نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اور خود اٹھ کر کمرے سے باہر سے چلی آئی۔ ارشی اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی نگاہوں میں ثمینہ کے لئے بہت پیار بھی تھا۔ اور حسرت بھی اور شکایت بھی تھی۔ اور پھر اس نے کراہتے ہوئے بڑے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد ذوالفقار اور ثمینہ کمرے کے پردے ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ارشی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ لیکن قدموں کی آہٹ پر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ثمینہ کے ساتھ اس کے والد کو دیکھ کر وہ اٹھنے لگا۔

اس نے عندلیب کی شادی میں انہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان سے تعارف نہیں حاصل کر سکا تھا۔ اور نہ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ ثمینہ کے والد ہیں۔

"تم لیٹے رہو بیٹا! کوئی بات نہیں!"
ذوالفقار نے اسے اٹھتے دیکھ کر بڑے سچے پیار بھرے انداز میں کہا۔
پھر تہمینہ نے مختصر سا تعارف کر دیا۔
"کہو کیسی طبیعت ہے؟ ذوالفقار علی اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
"جی رہا ہوں!"
ارشی نے اپنے مخصوص انداز میں اداسی سے جواب دیا۔
"سدا جیو میرے بچے!" ذوالفقار اس کے اس انداز سے متاثر ہوتے ہوئے بولے۔ نہ جانے انہیں یہ اجنبی نوجوان اتنا پیارا کیوں لگ رہا تھا۔ اس میں کیا بات تھی۔ جو ذوالفقار علی کو اتنا پسند آگیا تھا۔
"بیٹی ان کا ٹمپریچر لو!"
انہوں نے تہمینہ سے کہا اور وہ تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے تہمینہ سے مخاطب تھے۔
اور تہمینہ نے دیکھا کہ اسے ۱۰۴ درجے بخار تھا۔ وہ قدرے پریشان سی نظر آنے لگی۔ ارشی خاموش لیٹا ان کا جائزہ لیتا رہا۔
"بیٹے آپ کا گھر کہاں ہے؟ بہتر ہوتا ہے تا کہ آپ کے گھر میں اطلاع دیں۔ وہ لوگ بے چارے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

ذوالفقار نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
ان کے کہنے پر ارشی کو اپنی بہن کا خیال آگیا جو آج کل مدراس میں تھی۔ پرسوں ہی تو وہ اسے شہاب چچا کے ہاں چھوڑ کر آیا تھا ناجیہ بے چاری اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ جس کے لئے وہ مدراس جا رہی ہے وہ خود اس کے اپنے شہر میں موجود ہے۔"
آہ! "ناجو! تو کتنی مایوس ہوئی ہوگی۔ جب تجھے یہ معلوم ہوا ہوگا۔ کہ ثمینہ نہیں ہے۔" میں نے تمہیں کہہ دیا تھا۔ کہ ثمینہ کو میں حاصل نہ کر سکوں گا۔ تبھی تو تقدیر اتنے داؤ پیچ کر رہی ہے۔"
ارشی ذوالفقار کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوچوں میں گم تھا۔ اس کے چہرہ پر گہری اداسی چھا چکی تھی۔ ثمینہ اور ذوالفقار علی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
" بیٹا! تم نے اپنا ایڈریس نہیں بتایا۔"
ذوالفقار نے اس سے دوبارہ پوچھا۔
" جی۔ . . . . . . وہ . . . . . . دراصل . . . . میں آپ کو کیسا بتاؤں؟"
ارشی بوکھلا گیا۔
"نہیں بیٹے بتاؤ! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
ذوالفقار علی اسے پریشان دیکھ کر پیار سے بولے۔

"آپ سیٹھ شہاب کو تو جانتے ہی ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! انہیں تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟" ذوالفقار علی نے سوال کیا۔

"میری ایک بہن ہے ناجیہ! وہ مدراس انہیں کے ہاں کسی کام سے گئی ہوئی ہے۔" ارشی نے جواب دیا۔

"تو کیا ناجیہ وہاں ہیں؟ میں ابھی ٹرنک کال بک کرواکے انہیں بتاتی ہوں۔"

ثمینہ نے ارشی سے سوال کیا اور خود سیٹھ صاحب کے ہاں فون کرنے چلی گئی۔

ذوالفقار علی اس کے پاس بیٹھے اس کے بخار کے متعلق سوچ رہے تھے۔

ارشی تیز بخار کی وجہ سے بے چین سا تھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد وہ اپنی چھوٹی سی ڈسپنسری میں گئے۔ جو انہوں نے یہیں پر غریب لوگوں کی امداد کے لئے کھول رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک شیشی میں خوراک لئے آ گئے۔ ارشی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ لیکن دوائی پلانا ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے اٹھایا اور خوراک پلا دی۔ ثمینہ فون کر کے آ چکی تھی۔

"کہو بیٹی کیا بات ہوئی ناجیہ بیٹی سے؟"

ذوالفقار علی ثمینہ سے پوچھ رہے تھے۔

"وہ لوگ کل آرہے ہیں۔ ناجیہ غریب تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے اسے تسلی دی ہے۔

ثمینہ نے بتایا تو ارشی بہن کی پریشانی کے خیال سے اداس ہو گیا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس لئے ارشی نے ان دونوں کو آرام کرنے کے لئے کہا۔ لیکن ذوالفقار علی خود اس کے پاس ٹھہرنے پر مُصِر تھے۔

آپ آرام کریں ابو! میں خود ان کے پاس ٹھہرتی ہوں۔

ثمینہ نے باپ کی بے آرامی کے خیال سے کہا۔

آپ صاحبان ہرگز تکلف نہ کریں۔ اب میں اچھا ہوں۔ ارشی نے کہا۔

"اچھا ثمینہ بیٹی! تم ان کے پاس ٹھہرو! خدا نہ کرے۔ ضرورت پڑے تو مجھے ضرور بلوا لینا۔"

ذوالفقار نے محسوس کیا کہ ارشی فی الحال خطرے سے باہر ہیں۔ اس کی نگہداشت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بیٹی کو ہدایت کی اور خود سونے کے لئے چلے گئے۔

ارشی پیار اور احسان مندانہ نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا ذوالفقار علی کی دی ہوئی دوائی میں کسی خواب آور دوا کی آمیزش تھی

اس لیے اس پر غنودگی چھانے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ شیبہ کی موجودگی میں ابھی جی بھر کر اسے دیکھ لے۔ لیکن مصنوعی نیند نے اسے اس بات کی اجازت نہ دی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند میں سو رہا تھا۔

وہ اس عالم میں کتنا معصوم نظر آ رہا تھا۔ شیبہ اسی میں کھو گئی۔ اور رات صبح سے ہمکنار ہونے کے لئے آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

- - - - - - - ٭ - - - - - -

(۱۹)

دوسرے روز ناجیہ اپنے چچا سیٹھ شہاب اور صدف کے ہمراہ زمرد پہنچ گئی۔ وادی میں ذوالفقار کی عالیشان رہائش گاہ کافی مشہور تھی۔ اس لئے یہ لوگ جلد ہی کوٹھی پہونچ گئے۔ جہاں حنیفہ اور ذوالفقار نے بڑی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا۔

"میرے بھیا کا کیا حال ہے؟" حنیفہ مجھے جلد ان کے پاس لے چلو۔"

ناجیہ کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ وہ ذوالفقار علی کو سلام کرنے کے بعد حنیفہ سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولی۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی! ارشی اللہ کے فضل سے اب بہتر ہے۔" ذوالفقار نے اسے تسلی دی۔

اور یہ سب لوگ ارشی کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ لیکن دیوار کی طرف کروٹ لیئے لیٹا تھا۔ اسے اپنی بہن کے آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ کمرہ کے باہر بہت سے قدموں کی آہٹ پاکر وہ اسی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے بھیّا! یہ کیا ہوا آپ کو؟"

ناجیہ بھائی کے سر کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اور اس سے لپٹ گئی۔ اسے بھائی سے بے اندازہ لگاؤ تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔ ارشی بھی بہن سے مل کر کافی اداس ہو چکا تھا۔ سب لوگ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں کھوئے رہے۔

" روؤ نہیں میری بچی!

ذوالفقار ناجیہ کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

اس کے بعد سیٹھ صاحب نے ارشی کی مزاج پرسی کی۔

اور سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں 'ثمینہ' زینین کو مہمانوں کے لیئے کمرے درست کرنے کے لئے کہنے چلی گئی۔ پھر ان کے لئے ناشتہ وغیرہ اپنے سامنے تیار کروانے کے بعد وہ واپس آئی۔ اور ناجیہ کے برابر بیٹھ گئی۔

"تمہارا یہ احسان ہم تمام زندگی نہ چکا سکیں گے ثمینہ!"

ناجیہ پیار سے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ میرا فرض تھا۔"
ثمینہ نے جواب دیا۔
یہ لوگ دیر تک ادھر سے باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ملازم نے ناشتہ تیار ہو جانے کی اطلاع کی۔
"آپ لوگ غسل سے فارغ ہو جائیں۔"
ذوالفقار علی نے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے سیٹھ صاحب کو مخاطب کیا۔
ہم لوگ تو صبح غسل سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے نکلے تھے۔ اور ائر انڈیا کے آرام دہ جہاز نے ہمیں بغیر کسی تکان کے یہاں پہنچا دیا ہے آپ نے یوں ہی اتنا تکلف کیا ہے۔"
سیٹھ صاحب نے کہا۔
اس میں تو شک نہیں کہ اس سفر کے دوران کے آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی ہو گی۔ کیونکہ ائر انڈیا کا مہمان نواز عملہ اپنے مسافروں کے آرام کا خاص خیال رکھتا ہے۔ لیکن ائرپورٹ سے یہاں تک کا راستہ تو واقعی خاصہ دشوار گذار ہے۔ اور وہ تمام لطف جو جہاز کے سفر کے دوران آپ کو حاصل ہوا۔ کرکرا ہو گیا ہو گا۔"
ثمینہ جو ائر انڈیا کے جہازوں میں اکثر سفر کیا کرتی تھی۔ اور یہاں کے اونچے نیچے راستوں سے واقف تھی۔ سیٹھ صاحب کی تائید کرتے ہوئے بولی

"معاف کیجئے گا باجی! آپ نے یہ تو غلط کہا کہ راستہ میں ہم لوگوں کو کچھ دقت ہوئی۔ آپ کی خوبصورت وادی نے ہمیں کچھ اسی طرح اپنے حسین مناظر کی طرف متوجہ کیے رکھا۔ کہ ہمیں کسی تکلیف کا احساس ہی نہ ہوا۔"

صدف جو پہلی مرتبہ اس جگہ آئی تھی۔ اس وادی کے حسن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں تو تمہیں ہمیشہ آنے کے لئے لکھا کرتی تھی۔ لیکن تم تھیں کہ مدراس چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔"

نجمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"آ تو گئی ہوں نا باجی!"

صدف نے کہا۔

"اب جانے تو نہیں دوں گی تمہیں۔!"

وہ بولی۔

"ہاں بیٹی! اس دفعہ تو اس نے یہاں آنے کا پورا پروگرام بنا لیا تھا۔ بہن کے لندن جانے کے بعد تو یہ اکثر اداس ہو کر رو یا کرتی ہے۔ اس لئے سوچا کہ اب کے تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ وہ اتفاق سے ناجیہ کا آنا جلد ہو گیا۔ تو یہ بھی ساتھ ہی چلی آئی۔"

سیٹھ صاحب نے کہا۔

"بہت اچھا کیا تم نے بیٹی! اب تو مجھے بھی بے فکری جائے

گی۔ اور میں بھی اب دیر سے آؤں گا۔ کچھ دنوں بعد سعدیہ بیٹی بھی آجائے گی۔ ادھر ناجیہ اور ارشی بھی اب یہیں رہیں گے۔ کیونکہ جب تک ارشی بالکل تندرست نہ ہو جائے میں اسے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"
ذوالفقار علی نے صدف کی طرف شفقت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس دفعہ تو بہت لطف آئے گا۔ ابو جان!"
تحیہ مارے خوشی کے کہنے لگی۔ اس کا معصوم چہرہ اس وقت پھول کی طرح کھلا جا رہا تھا۔
ارشی خاموش لیٹا ان سب کی باتیں سن رہا تھا۔ بزرگوں کی نظر بچا کر وہ تحیہ پر بھی پیار بھری نظریں پھینک دیتا۔ ذوالفقار علی کے کہنے پر اس کے زرد چہرے پر رونق آگئی
"اتنے دنوں تحیہ کے قریب رہنے کا موقع ملے گا۔"
یہ سوچ ہی کتنی پیاری تھی۔ جس نے ارشی اور تحیہ کی روح کو ایک انوکھی خوشی سے ہمکنار کر دیا۔ یہ صرف دو پیار کرنے والے دل ہی جانتے ہیں۔
آپ لوگ چلئے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔
ذوالفقار علی نے اصرار کر کے ان لوگوں کو ناشتہ کی میز پر پہنچایا۔
ارشی کی دوا کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لئے تحیہ اسے دوا پلانے لگی۔

"آپ کو میری وجہ سے کتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔ اس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں۔"
ارشی نے ثمینہ کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔
"آپ ایسی باتیں کر کے مجھے بہت شرمندہ کر دیتے ہیں۔"
ثمینہ جو اس وقت اکیلے میں اور کچھ ارشی کے اس قدر قریب آنے پر شرما رہی تھی۔ اس سے شگفتہ آمیز انداز میں بولی۔
سوچتا ہوں ثمینہ! . . . . . کہ . . . . .
ارشی صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔
"جی!
ثمینہ نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کہ کاش! میں زندگی بھر یوں ہی بیمار رہوں۔ اور تم یوں ہی میرے قریب رہو!۔"
ارشی نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
اس لمحہ اس کی حسین آنکھیں ایک انجانے جذبہ کے تحت چمک اٹھیں۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"
ثمینہ نے اس کی یہ بات سن کر نہ جانے ایسا کیوں کہہ دیا۔ اس کا مطلب کچھ اور تھا۔ لیکن ارشی اتنی سی بات پر پھر غلط فہمی کا شکار

" اوہ! کچھ نہیں ترپتا بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہک گیا تھا۔ تم میری ایسی باتوں کا برا نہ مانا کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ مجھے ایک دیوانہ سمجھ کر معاف کر دیا کرو۔"

ارشی کی آنکھوں کی کچھ دیر پہلے والی چمک کی جگہ ایک گمبھیر اداسی نے لے لی ۔ اس کے چہرہ کی زردی کچھ اور بھی بڑھ گئی ۔ اور ترپتا ان خیالات پر حیران و ششدر سی رہ گئی ۔

کیا ارشی اب تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے ۔؟ کیا اسے میرے جذبات کا علم نہیں ؟ کیا وہ میرے دل کا حال میری ان آنکھوں سے اب تک نہیں پڑھ سکا ۔

تم سچے ہو ارشی! تم مرد ہو نا! مرد! جو اپنے جذبات کا اظہار کر دینے میں فوراً اپنی زبان سے کام لینا نہیں جانتا ہے ۔ انہیں کسی قسم کا خوف جو نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں ایک عورت ہوں ایک لڑکی! جو اپنے دل کی اس آواز کا گلا اپنے سینے ہی میں گھونٹتی رہتی ہے ۔ اس کے دل کی یہ آواز آہوں کی صورت میں صرف اس کے لبوں تک آکر دم توڑ دیتی ہے ۔ لیکن کسی اور کو سنائی نہیں دیتی ۔ وہ سب کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی نہیں کہہ پاتی ۔

ہاں ! اس کی آنکھیں اس کے دل کی ترجمان بن جاتی ہیں ۔ لیکن ارشی کی آنکھوں پر غلط فہمی کے دبیز پردے پڑ چکے تھے ۔ جن کی اوٹ سے وہ ترپتا کے جذبات کو نہ پڑھ سکا ۔ اور وہ بے چاری خاموش رہ گئی ۔ اس

کے سینہ میں ارشی کے ان باتوں نے ایک طوفان سا برپا کر دیا۔

" وہ انگوٹھی آپ کی انگلیوں میں نہیں نظر آ رہی ہے۔"

ارشی نے ایک اور تیر کھینچا جو نشانہ پر بیٹھا!" اور جو طنز سے بھرپور تھا۔

" آپ مجھے پاگل کر دیں گے ارشی!"

ثمینہ کی حسین آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں۔ ضبط کا بند لاکھ باندھنے پر بھی ٹوٹ چکا تھا۔ آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسل پھسل کر اس کے دوپٹہ میں جذب ہونے لگے۔ روتے ہوئے وہ کتنی معصوم نظر آ رہی تھی۔ ارشی کو اس کی چھلکتی آنکھیں بہت پیاری لگیں۔ جیسے دو جلتی شمعیں زیر آب ہوں۔ وہ چند ثانیئے اسی حسین منظر میں کھویا رہا۔

"تم نے یہ کہا تھا ثمینہ! کہ میں تمہیں پاگل بنا دوں گا۔ میرے ایسے نصیب کہاں؟ لیکن تمہیں بھی تو اس کا احساس نہیں کہ تم نے کسی کو پاگل بنا دیا ہے۔"

ارشی نے بڑے دکھی انداز میں ثمینہ کی بات دہراتے ہوئے کہا۔

" اُف! آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

ثمینہ نے تڑپ کر ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف دیکھا۔

" بہت خوب! یہ نہ سمجھنے کا الٹا الزام مجھ غریب پہ کیوں لگایا جا رہا ہے۔ ارشی نے پھر طنز کی۔

"آپ اس انگوٹھی کے متعلق سراسر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کیسا۔ انگوٹھی، صرف کسی کی نشانی ہی ہو سکتی ہے۔"

ثمینہ نے آخر بار اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کہہ ہی دیا۔

"تو کیا۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ انگوٹھی تمہاری اپنی ہے؟"

ارشی مارے خوشی کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثمینہ کے منہ سے یہ سن کر وہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا۔

او۔ ثمینہ نے بڑے پیارے انداز میں اثبات میں گردن ہلا دی۔ اور اس کا یہ اقرار ارشی کی دنیائے محبت میں ایک انوکھا قرار محبت بن کے آیا۔ اس کی روح تک خوشی سے جھوم اٹھی۔

اس کی مسرت دیکھ کر کھل گئی

یہ احساس کہ ارشی اس کو اس قدر چاہتا ہے۔ اس کے لئے کتنا مسرور کن تھا۔

ثمینہ! میں آج کتنا خوش ہوں! یہ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

ارشی نے والہانہ انداز سے اپنے قریب کرسی پر بیٹھی ثمینہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑتے ہوئے مسرت کے بوجھ تلے کانپتی آواز میں کہا۔

ارشی کے ہاتھوں کے شکنجہ میں ثمینہ کے ہاتھ بری طرح جکڑ چکے تھے۔ ثمینہ کے دل کا عجب عالم تھا۔ شرم و گھبراہٹ نے اس کے حسین چہرہ کو اور بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ خود میں ارشی سے

نظریں ملانے کی ہمت نہ پارہی تھی۔ لیکن یہ احساس کہ کوئی اس طرف نہ آنکلے اس کی گھبراہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔

"آپ لیٹ جایئے۔ ابھی آپ کے زخم اچھے نہیں ہوئے۔"
تمینہ نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی ناکام جد وجہد کرتے ہوئے بغیر آنکھیں اٹھائے کہا۔

"جن زخموں کا تم ذکر کر رہی ہو تمینہ۔ وہ تو اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن دل کے زخموں کا کیا علاج کروں؟ وہ تو صرف تم ہی اچھا کر سکوگی۔ کہو مسیحا بنوگی؟"

ارشی نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اس کا جھکا ہوا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

ارشی کے ان الفاظ سے اس کے رخساروں پر شفق سی پھوٹ پڑی۔ اور نشیلی آنکھیں حیا کی سرخی سے اور بھی زیادہ حسین نظر آنے لگیں۔ بند آنکھوں پر لمبی پلکوں کا سایہ تھا۔ اس لئے ارشی اپنے سوال کا جواب ان میں نہ پا سکا۔

"میں نے کیا پوچھا ہے تمینہ!"
ارشی بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ پیار نے اس کی آواز کو اتنا پرکشش بنا دیا تھا۔ کہ اس کے جادو سے تمینہ نے ایکدم اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں۔

اور ارشی کو ان کی سمندر کی سی گہرائی میں اپنے پیار کا

جواب مل گیا ۔

ارشی کی غلط فہمی دور ہو چکی تھی ــــــــــــــــــ اور وہ خود کو ایک نرالی دنیا میں پا رہا تھا ۔ اس کے پیار کا جہان آباد ہو چکا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے سرور چھلکا پڑ رہا تھا ۔

- - - - - - - - : - - - - -

(۲۰)

ثمینہ کے پیار نے ارشی کو جلد ہی اچھا کر دیا۔ ابھی وہ بہت کمزور تھا چلنے پھرنے کے قابل تو ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ہر وقت یہی دعا کرتا کہ کاش! وہ اسی حالت میں رہے۔ تاکہ اس صورت ثمینہ کا قرب حاصل ہو سکے۔ جیسے جیسے اس کی حالت سنبھل رہی تھی۔ وہ اداس ہوا جاتا تھا۔ کیونکہ صحت مند ہو جانے کی صورت میں تو یہاں ٹھہرے رہنا کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور جب کہ ان کی اپنی رہائش بھی شملہ میں ہی تھی۔

لیکن ایک دن باتوں ہی باتوں میں ذوالفقار علی نے ناجیہ سے کہہ دیا۔ کہ وہ دونوں اب انہیں کے ہاں مقیم رہیں گے۔ اور یہ جان کر ارشی کتنا خوش ہوا۔ کہ اور کچھ عرصہ جب تک کہ ثمینہ کے کالج میں چھٹیاں

ہیں۔ یہ لوگ زمرد میں ہی رہیں گے ۔

مدراس سے سعدیہ بھی آچکی تھی ۔ یہاں بہ خلاف معمول خاصی رونق دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئی ۔ بے چاری ثمینہ کو یہ تینوں لڑکیاں اکثر چھیڑا کرتی تھیں ۔ اور ارشی کے نام پر چھیڑے جانے سے وہ جھینپ جاتی ۔

ناجیہ کو ارشی نے بتا دیا تھا کہ اس کے خیال کے مطابق واقعی وہ انگوٹھی ثمینہ کی منگنی کی نہیں بلکہ خود اس کی اپنی ہے ۔

ثمینہ کا ارشی کی طرف رجحان اور ذوالفقار علی کی اپنائیت ناجیہ کے لئے کافی تسلی بخش بات تھی ۔ اور یہ خیال کہ ایک نہ ایک دن وہ ثمینہ کو اپنی بھابی کے روپ میں دیکھے گی ۔ اس کے لئے بہت دل خوش کن تھا ۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے بھائی کی خوشی نہال ہوئی جاتی تھی ۔

ارشی کی صحت روز بروز اچھی ہو رہی تھی ۔ پچھلے بیمار نے اس میں کس قدر قوت مدافعت پیدا کر دی تھی ۔ اور وہ ہفتوں میں اچھا ہونے کی بجائے دونوں میں خاصہ تندرست و توانا ہو گیا ۔

سیٹھ شہاب اور ذوالفقار علی واپس مدراس جا چکے تھے ۔ ان کا کام پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا تھا ۔

گاؤں میں نئے ہسپتال کے بن جانے کے بعد اس میں نئے عملہ کی ضرورت تھی ۔ اس کے علاوہ ابھی وہ بیماریوں کے لئے ادویات

خرید رہے تھے۔ اس کے لئے انہیں کافی وقت کی ضرورت تھی۔ اور وہ دنیا کے ہر کام سے بے نیاز خدمت خلق میں کھو گئے تھے۔

ادھر ارشی کے صحت یاب ہو جانے کے بعد وادی زمرد میں جیسے انکی بہاریں لوٹ آئی تھیں۔ دور دور پکنک کے پروگرام بنتے۔ تو اس حسین وادی کی اونچی نیچی پہاڑیوں پر ہر طرف ثمینہ اور ارشی کے ہمراہ صدف ناجیہ اور سعدیہ کے قہقہے گونج اٹھتے۔

زندگی کتنی خوبصورت ہو چلی تھی۔ ارشی اور ثمینہ جیسے دکھوں کے احساس اور غم کے نام سے نا آشنا سے ہو گئے تھے۔ وادی کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے۔ کہ ارشی وہی شخص ہے۔ جو دس بارہ دن پہلے ندی کے پاس بے ہوش پڑا پایا گیا تھا۔ ثمینہ کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھ کر وہ بھی سمجھ رہے تھے۔ کہ یہ لوگ کنول رانی کے رشتہ دار ہیں۔ سعدیہ تو اکثر اس کے پاس گریاں گڑوں سے آجایا کرتی تھی۔ ثمینہ کی دیہاتی سہیلیاں ان سب کی موجودگی میں اس سے کچھ دور دور رہنے لگی تھیں۔ لیکن ثمینہ اب بھی انہیں اسی خلوص سے ملا کرتی تھی۔ ایک دن ارشی اپنے دوستوں میں بیٹھا تھا۔ جو اس کے فون کرنے پر اسے ملنے چلے آئے تھے۔ اور یہ سب لڑکیاں جھیل کے کنارے سیبوں کے پیڑوں کے سائے میں بیٹھی تھیں وادی کی چند لڑکیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ اور ناجیہ وغیرہ سے وہ لوگ چند ملاقاتوں میں بے تکلف ہو گئی تھیں۔ ان میں گلبن سب سے زیادہ شریر تھی۔ ویسے تو سب کو ارشی اور ثمینہ کے متعلق شک تھا۔ لیکن گلبن

جو شریر ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک بھی تھی۔ ان دونوں کے آپس میں میل جول اور ثمینہ کے چہرے سے سب کچھ تاڑ چکی تھی۔
اس وقت ثمینہ جھولا جھول رہی تھی۔ اور گلبن اسے ہلکورے دے رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ سوچ چکی تھی کہ لبینہ سے ارشی کے متعلق پوچھے گی۔ اور اب موقعہ تھا۔
باقی لڑکیاں پاس ہی جھیل میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ ناجیہ ثمینہ کے قریب کھڑی تھی۔
"ایک بات پوچھوں کنول رانی؟"
گلبن نے شرارت سے مسکراتے ہوئے لبینہ کو مخاطب کیا۔
"کیا بات ہے گل؟ وہ گلبن کو پیار سے گل کہا کرتی تھی۔
"ہے ایک بہت پیاری سی بات!"
گلبن نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ارے پوچھ بھی چکو!"
ثمینہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"اپنے ارشی بھیا ہیں نا! بس انہیں کے متعلق پوچھنا ہے۔" وہ پھر شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہنے لگی۔ ارشی کا نام سن کر ثمینہ ناجیہ کی موجودگی میں شرما سی گئی۔
"مجھ سے شرما رہی ہو یا ہمارے ہونے والے دولہا بھائی کے نام سے؟"

گلبن اسے گدگدا کر پوچھنے لگی۔ اس پر ناجیہ بھی ہنس دی۔ اور ثمینہ اس کی موجودگی میں گلبن کے الفاظ پر شرم سے سرخ ہوگئی۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر!" ناجیہ بھی شرارت میں گلبن کے ساتھ شریک ہوگئی۔

"آپ کب ہماری کنول رانی کو اپنی بھابی بنا رہی ہیں۔ گلبن پوچھ رہی تھی۔

"انشاء اللہ بہت جلد!"

ناجیہ نے ثمینہ پر پیار بھری نظریں نچھاور کرتے ہوئے خلوص دل سے کہا۔

"خدا کے لئے چپ ہو جاؤ!۔"

ثمینہ نے شرم سے مغلوب آواز میں کہا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک جھیل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر اگی خوبصورت پھولوں سے لدی جھاڑیوں کے عقب سے ارشی نکل کر ان کے سامنے آگئے۔ وہ اور اس کے دوست عابد، رضوان اور عادل کب سے کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"بھئی مداخلت معاف! میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہاں کنول رانی کون ہے؟"

ارشی جو کہ ثمینہ کے اس نام سے آج ہی واقف ہوا تھا۔ شرارت سے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ اس کے یوں چلے آنے سے سب لڑکیاں

اس کے گرد اکھٹی ہوگئیں۔

گلبن جو کہ ارشی کی غیر موجودگی میں بڑے بے تکلف انداز میں اسس کا نام لے کر نغمینہ کو کافی دیر سے چھیڑ رہی تھی۔ اب ارشی کے آجانے سے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں عنبر اور گلہارہ بھی اس کے پیچھے بھاگیں۔

جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے عابد سے گلبن ایک دم ٹکرا گئی۔ بے چارہ عابد بوکھلا سا گیا۔ اور جھک کر زمین پر گری گلبن کو اٹھانے لگا۔

"اوہ! معاف کرنا" ..... عابد صرف اتنا کہہ سکا۔

"اونھ! معاف کرنا! بالو تمہیں نظر نہیں آتا۔ یہ موا چشمہ کاہے کو لگا رکھا ہے؟ اتار پھینکو اسے۔"

گلبن کا حسین چہرہ مارے غصہ کے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور عابد کی نقلیں اتار رہی تھی۔ وہ بے چارہ چپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے ڈانٹ پلا کر وہ ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی اپنی سہیلیوں سے جا ملی جو کچھ فاصلہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ اصل میں ان لڑکوں سے ڈر رہی تھیں۔ ان کے والدین نے ان شہری لڑکوں کے خلاف ان کے دلوں میں کافی ڈر خوف بٹھا رکھا تھا۔ کہ وہ کس طرح غریب بھولی بھالی دیہاتی لڑکیوں کو بہکا کر تباہ کر دیتے ہیں۔

عابد نہ جانے کیوں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر وہ لڑکیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

"واپس آجاؤ! وہ تو چلی گئی!"

رضوان نے اس کا کندھا ہلایا۔

"طبیعت تو صاف ہو گئی ہو گی جناب کی۔" عادل نے اس پر طنز کیا۔

مجھے تو اس پر غصہ آرہا ہے۔ کہ کس طرح اس اجڈ اور جنگلی سی لڑکی سے ڈانٹ کھا کر خاموش رہا۔

رضوان نے اس کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں اس کا کیا قصور ہے؟"

عابد نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا بھئی! مجھے تو ان کے ادھر کچھ گڑبڑ معلوم ہو رہی ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔"

عادل نے ہنس کے اس کھوئے ہوئے انداز پہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے عابد کی طرف اشارہ کیا۔ تو عابد اور عادل۔۔ ہنس دیئے۔

اتنے میں ارشی سب لڑکیوں کے ہمراہ ان کے پاس آیا۔

"کیوں بھئی یہ ایکٹنگ کیسی ہو رہی ہے۔"

وہ عادل کو ہاتھ نچاتے دیکھ چکا تھا۔

"ان حضرت کے ساتھ ایک بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔"

رضوان نے عابد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ لڑکیوں کی موجودگی میں عابد بے چارہ کچھ شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ اور اسے منع کرنے کے لئے گھور رہا تھا۔

"یہ آنکھیں ہم پر خاک اثر نہیں کریں گی۔ ہم اس تصادم کا ذکر بھری محفل میں کریں گے۔ یہاں کوئی بھی تو پرایا نہیں سب اپنے ہی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں تمہارا کوئی ہمدرد بھی مل جائے۔"

رضوان نے اس کی نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بات کچھ اس مضحکہ خیز انداز میں کہی کہ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

رضوان بھائی آپ ان بے چارے عابد بھیّا کو کیوں تنگ کرتے ہیں۔

ثمینہ نے عابد کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"چلئے! آپ کے کہنے پر انہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی بتاؤں گا ضرور!"

رضوان نے شرارت سے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو عابد نے ثمینہ کا شکریہ ادا کیا۔

ملازم کے اطلاع دینے پر سب لوگ شام کی چائے پینے کے لئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۲۱)

ثمینہ نے آج پکنک کا پروگرام بنایا۔ جس میں ارشی کے دوست بھی شامل تھے۔ عابد، رضوان اور عادل صبح ہی دادی ذمردیش' ثمینہ کے ہاں موجود تھے۔ سب لڑکیاں پکنک کی تیاری میں مشغول تھیں۔ آپا اماں انواع و اقسام کے کھانے پکوا رہی تھیں۔ ارشی تیار ہو چکا تھا۔ وہ نیل گرے سوٹ میں کتنا شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ اس رنگ میں نکھرا نکھرا پڑتا تھا۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور یہ لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

"بھئی! یہ لڑکیاں آخر تیار ہونے میں اتنی دیر کیوں لگاتی ہیں۔؟"

عابد نے انگڑائی لیتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں جمادیں۔

"اجی! آپ کو کس بات کی بے چینی ہے۔ آپ کی کل والی چیتا سے آپ ٹکرا گئے تھے۔ وہ تو ان کے ساتھ نہیں۔"

رضوان نے اسے چھیڑا۔

اور رضوان کی اس بات پر عابد کچھ اداس سا ہو گیا۔

"مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے دوست!"

ارشی جو دوستوں کی زبانی کلپن اور عابد کے آپس میں ٹکرا جانے کے متعلق سن چکا تھا۔ اسے کھویا کھویا سا دیکھ کر چھیڑ رہا تھا۔

"تم لوگ تو پاگل ہو رہے ہو۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

عابد نے جھینپ کر کہا۔

برآمدے میں ابھرتی قہقہوں کی آواز سن کر یہ سب ادھر متوجہ ہوئے۔

"کنول رانی! دیکھو تو میں تمہارے لئے کتنے پیارے پھول لائی ہوں۔ لیکن یہ بنیر مجھ سے چھین رہا ہے۔ کہتا ہے کہ میں خود کنول رانی کو پھول دوں گی۔ بابا آج ہی ندی کے اس پار گئے تھے۔ جہاں جھیل میں اتنے ڈھیر سے کنول کھلتے ہیں۔ سچ! ابھی تم ادھر جاؤ تو کھو جاؤ گی۔ وہاں۔"

نینا اس وقت برآمدے کی سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ وہ

پکنک کے لئے تیار ہو کر اپنے کمرہ سے چلی آئی تھی ۔ اور اب دوسری لڑکیوں کا انتظار کر رہی تھی ۔ شہابی ریشم کا لباس اس پر کتنا پیارا لگ رہا تھا ۔ وہ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی ۔ کہ گلبن اور عنبر نے اسے خیالوں کی دنیا سے چونکا دیا ۔ وہ ہنستی ہوئی ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں ۔ گلبن کے آنچل میں کتنے سارے کنول پھول تھے ۔ ۔ ۔ ثمینہ کے پسندیدہ پھول !

اور گلبن کی آواز عابد کے علاوہ باقی سب لڑکے بھی پہچان چکے تھے ۔ اور اب عابد کی طرف شریر نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔

" طلب صادق ہو تو ایسی ہو ! "

ارشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا ۔

عابد کی بے تاب نگاہیں بار بار دروازے سے باہر کچھ دیکھنے کے لئے اٹھ جاتیں ۔ لیکن درمیان میں دبیز پردے حائل تھے ۔ اس لئے وہ بے چارہ دوستوں کے سامنے اٹھ کر باہر بھی نہیں جا سکتا تھا ۔ یہی حال ارشی کا بھی تھا ۔ اسے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ثمینہ بھی برآمدے میں موجود ہے

" صاحبزادے ! دل تو تمہارا بھی باہر برآمدے میں کھویا ہوا ہے ۔ "

عادل نے ارشی کے سر پر دھول جماتے ہوئے پیار سے چھیڑا ۔

" ارے جانے دو ان دونوں نالائقوں کو ۔ یہ تو اب گئے کام سے ۔ ۔ "

رضوان نے ارشی اور عابد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برا سا منہ بنایا۔ تو سب ہنس دیئے۔

برآمدے میں بہت سے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد ہی ملازم نے اطلاع دی۔ کہ سب سامان جیپ میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ لوگ اٹھ کر باہر نکلے جہاں سب لڑکیاں حسن کی بارش کر رہی تھیں۔

"چلیئے آپ سب تیار ہیں نا؟"

ارشی نے بھرپور نظر سے ثمینہ کو دیکھا۔ تو وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور اپنی خوبصورت آنکھیں بار بار اٹھانے اور گرانے لگی۔

"تمہاری ان پیاری آنکھوں کی یہ ادائیں میرے دل پر قیامت بن کر گزر جاتی ہیں، ثمینہ!"

ارشی جو اتفاق سے اس کے بالکل قریب تھا۔ آہستہ سے اس سے کہنے لگا۔ اور بے چاری ثمینہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ نا جیبہ برابر ان دونوں ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ ارشی تو ایک طرف، وہ خود بھی تو اس پیاری سی لڑکی پر مر مٹی تھی۔

"دوست! بس اب چلنا چاہیئے۔ سرگوشیاں تو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔"

رضوان نے ارشی کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

"کنول! کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

گلبن جو دیر سے چپ چاپ کھڑی تھی۔ ثمینہ سے پوچھنے لگی۔

"تم لوگ بھی چلو نا ہمارے ساتھ! ہم سب تو بنفشہ جا رہے ہیں۔"

ثمینہ نے اس سے چلنے کے لئے اصرار کیا۔

"بابا سے بھی تو نہیں پوچھا۔ وہ فکر کریں گے۔ تیرے ہاں آنے کا کہہ کر آئی ہوں۔ اور عنبر کی ماں بھی پریشان ہوگی۔ نہ جانے تم لوگ کب لوٹو گے۔"

گلبن بڑے سادہ انداز میں ثمینہ سے مخاطب تھی۔ اس کی آنکھوں میں کل والے واقعہ کا نقشہ کھنچ گیا تھا۔ نہ جانے وہ ان شہری لڑکوں سے اتنا کیوں گھبرا رہی تھی۔ اس دوران غیر ارادی طور پر اس کی نظریں عابد سے ٹکرا گئیں۔ تو اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ لیکن اس نے نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔

"تم لوگوں کے گھر پاس ہی تو ہیں۔ میں وہاں اتر کر بابا سے کہہ دوں گی۔ کیا پھر بھی وہ انکار کر دیں گے؟"

ثمینہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو چلو پھر!"

گلبن نے جواب دیا۔ اس کے منہ سے جانے کے متعلق سن کر عابد کی [illegible] نہ رہا۔ نہ جانے وہ اس سیدھی سادی مگر

حسین دیہاتی دوشیزہ کو اس قدر کیوں چاہنے لگا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے دل سے یہ سوال کیا۔ لیکن اسے اس کیوں کا کوئی جواب نہ مل سکا۔

دو ملازمین اور آپا جی بھی ساتھ تھے۔ یہ لوگ سامان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے۔

عابد کی کار میں رضوان اور عادل بیٹھ گئے اور دوسری میں یہ سب لڑکیاں۔ اسے ارشی ڈرائیو کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ روانہ ہو گئے۔

بنفشہ وادی زمرد کے بالکل ساتھ ہی ایک اور خوبصورت وادی کا نام ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ حسین مناظر کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ثمینہ صرف ایک دفعہ پہلے یہاں آ چکی تھی۔ راستہ کافی لمبا تھا۔ لیکن حسین موسم اور زندگی کے ہمسفر کی موجودگی نے اس طوالت کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ اور دوپہر تک یہ لوگ زمرد کی حدود سے نکلنے والے تھے۔

"کنول رانی! بھول گئی ہو کیا؟ بابا سے اور عنبر کی ماں سے ہمارے متعلق نہیں پوچھو گی؟"

گلبن نے ثمینہ سے کہا تو وہ ارشی کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ جیسے اسے کار روکنے کے لئے کہہ رہی ہو؟"

اور ارشی نے گلبن کی بات سن لی تھی۔ لیکن وہ ثمینہ کے

بلانے کا منتظر تھا۔ سب سہیلیوں کی موجودگی میں بھلا وہ کیسے اسے بلاتی۔ وہ تو پہلے ہی راستہ بھر اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی آ رہی تھیں البتہ ان کی تمام باتیں سنتا رہا لیکن بظاہر لاپرواہی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔

" بھیا! یہاں پر تھوڑی دیر رکنا ہے۔" ثمینہ کو تذبذب میں پا کر ناجیہ نے بھائی سے کہا۔

ارشی نے چھوٹے چھوٹے کچے مکانات کے قریب اپنی کار روک لی۔ انہیں رکتا دیکھ کر ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر عابد بھی رک گیا۔ کار کے ہارن پر چھوٹے چھوٹے بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عورتیں گھروں سے جھانکنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ خدا نے اس وادی کو تو حسن بخشا تھا۔ لیکن یہاں کے لوگ بھی اس دولت سے خالی نہ تھے۔

گلین کار سے اتر کر ان میں سے ایک گھر میں داخل ہوئی۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ ایک بوڑھے سے شخص کو لئے آ گئی۔

ثمینہ نے اور سب نے اسے سلام کیا۔

کیسی ہو کنول بیٹی!

بابا نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

" اچھی ہوں بابا!

ثمینہ نے جواب دیا۔

" میری بیٹی نے یہاں آنے کی تکلیف کیسے کی؟

بابا نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

بابا! ہم لوگ بنفشہ جا رہے ہیں۔ گلینا میرے ساتھ جا رہی ہے بس شام ہونے سے پہلے آجاؤں گی۔ اور اسے یہاں پہونچا دوں گی۔ آپ اسے جانے دیں۔

ثمینہ نے اجازت مانگی۔

ہاں! بیٹی! کوئی بات نہیں لے جاؤ!

بابا نے جواب دیا۔

"ماموں! ماں کہاں ہے؟ کیا گھر بیٹھا؟

عنبر نے پوچھا۔

بیٹی! تیری ماں تو صبح کہیں گئی تھی۔ کیوں کیا بات ہے؟ تو بھی ساتھ جا رہی ہے؟ بابا نے پوچھا۔

"جی ماموں!"

عنبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلی جا! وہ آئے گی تو میں اس سے بول دوں گا۔" بابا نے اسے بھی اجازت دی۔

"شکریہ بابا!"

ثمینہ نے بابا کا شکریہ ادا کیا۔

"اللہ کے حوالے بیٹی! سدھارو خیر سے!"

بابا نے دعا دی اور لوگوں نے کاریں سٹارٹ کر دیں۔ اور بنفشہ کے لیئے روانہ ہو گئے۔

---

(۲۲)

بنفشہ کس قدر خوبصورت جگہ ہے؟ یہ سب لوگ اس مقام کے حسن کو دیکھ کر دنگ تھے۔ زرخیز پہاڑیوں سے گھری ہوئی یہ وادی قدرت کی صناعی کا نمونہ تھی۔ دور دور تک پہاڑوں پر صنوبر کے درخت عجب آن بان سے ایستادہ تھے۔ بل کھاتی ندیاں اور شور مچاتی آبشاریں۔ اس وادی کے حسن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ جنگلی گلاب کی بیلیں درختوں کے تنوں سے دیوانہ وار لپٹ رہی تھیں۔ اور فضا میں کچھ بادامول کی باس، ان پھولوں کی مہک میں رچ کر ایک رومان پرور سا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی سڑکوں پر چیل کے دو رویہ اگے پیڑ سایہ فگن تھے۔

یہاں سکون ہی سکون تھا۔ جو گاہے گاہے پرندوں کی چہکار

سے منتشر ہو جاتا۔

سڑک کے ایک طرف کاریں پارک کی گئیں اور کسی موزوں جگہ کی تلاش جاری ہوئی۔ آخر انہیں ایک بہت پیاری جگہ پسند آئی شفتالو کے جھنڈ تلے ندی کے کنارے ملازموں نے ایک بہت بڑی فرشی دری اور اس کے اوپر قالین بچھا دیا۔ باقی سامان کچھ فاصلہ پر رکھا گیا۔ ثمینہ سب کچھ بھول کر ان دلکش نظاروں میں کھو چکی تھی۔

یہ سب اس پر فضا ماحول سے کافی متاثر دکھائی دے رہے تھے کچھ ادھر ادھر گھومنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد تصویریں اتارنے کا پروگرام بنا۔ ارشی اور عابد نے مختلف انداز میں ان سب کی تصویریں اتاریں۔

رضوان کی ضد پر لڑکوں نے کیرم سنبھالا۔ اور کھیلنے میں مشغول ہو گئے ثمینہ وغیرہ گھومنے چلدیں۔

پہ کتنے بد ذوق انسان ہیں؟ بھلا اس مقام پر اگر کسی کا دل چاہتا ہے۔ کہ کھیلنے میں لگ جائیں۔ یہاں کے دلفریب مناظر دیکھتے دیکھتے ہی دل نہیں اکتاتا۔،،

ناجیہ نے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت آمیز انداز میں کہا۔

عنبر اور گلبدن کو ان شہر کے رہنے والے لوگوں کا یہاں کے قدرتی مناظر سے اس حد تک دلچسپی ظاہر کرنا کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

شاید وہ اس حسین ماحول میں رہتے رہتے عادی ہو چکی تھیں۔ کہ ان کے لئے یہ مست نظارے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کی محویت یہ حیران سی ایک دوسرے کو دیکھ لیتیں۔ وہ تو سنتی آئی تھیں کہ شہر میں ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ جو ایک دفعہ وہاں چلا جائے دوبارہ مشکل سے ہی گاؤں کی شکل دیکھتا ہے۔ ان کے گاؤں کے کتنے ہی نوجوان شہر گئے لیکن اب تک واپس نہیں آئے۔ جانے کون سی انوکھی بات تھی وہاں کہ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت ان شہر کے باسیوں کی ان کے گاؤں سے اتنی چاہت محسوس کرتے ہوئے وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکیں۔ ہاں ان کے دلوں میں ایک نئے احساس نے جنم لیا۔ اور وہ سر تان کر ان لڑکیوں کے درمیان چلنے لگیں۔ انہیں اپنے اس حسین گاؤں پر فخر محسوس ہونے لگا۔

"کنول رانی! چلو ہم لوگ تمہیں ایک ایسی جگہ دکھاتے ہیں جہاں جاکر تم خود کو بھی بھول جاؤگی۔"

گلبن نے ثمینہ کو مخاطب کیا۔ تو سب لڑکیاں پر اشتیاق نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گیئں۔

"چلو چلیں!"

ثمینہ دفور شوق سے بولی۔ اس کی حسین آنکھوں میں کسی جذبہ سے جگمگاہٹ سی پیدا ہو گئی اور وہ گلبن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی

"پہلے ہم لوگ وضو کر لیں۔"

عنبر نے کہا:

اور اس کے کہنے پر سب لڑکیاں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تو کیا کسی مسجد میں جانے کا ارادہ ہے۔"

صدف نے عنبر کو مخاطب کیا۔

"نہیں تو۔ ہم جہاں جا رہے ہیں۔ وہاں ایک خانقاہ ہے۔"

عنبر نے جواب دیا۔

سب لڑکیاں ندی کی طرف بڑھیں اور اس کے کنارے پر بیٹھ کے وضو کرنے لگیں۔ یہ ایک عجیب پر تقدس سا منظر تھا۔ جس پر وادی کے تمام حسن جیسے ماند پڑ گئے۔ ندی کا کنارہ جس پر خوبصورت لڑکیوں کا جھرمٹ۔ ہر ایک پانی میں جھکی وضو کر رہی تھیں ـــ اس وقت سب کے چہروں پر نور کا سا تاثر چھا رہا تھا۔ آخر یہ سب ماہ جبینیں وضو سے فارغ ہوئیں۔

"کنول! سب اپنے ساتھ تھوڑے پھول لے لیتے ہیں۔ مزار پر چڑھا دیں گے۔"

گلبدن نے ثمینہ سے کہا۔

جنگلی گلاب کی قریب اگی جھاڑیوں پر کثرت سے پھول کھلے تھے سب نے اپنے اپنے آنچل ان خوشبو دار پھولوں سے بھر لئے یہ منظر تو کچھ اور بھی دلفریب تھا۔ یوں نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی مندر کی دیو داسیاں اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں پھولوں کا چڑھاوا چڑھانے جا رہی ہوں

غرض یہ لوگ نورکی برسات کرتیں گلبن اور عنبر کی سرکردگی میں بڑھ رہی تھیں۔ یہ دونوں جو یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھیں۔ ان کے آگے آگے تھیں۔

ان لوگوں کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کس وقت ارشی اور اس کے باقی دوست بڑی ہوشیاری سے چھپ کر ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کیرم کھیلنا تو صرف ایک بہانہ تھا۔ ان کا مطلب تھا کہ چھپ کر کوئی شرارت کی جائے۔ لیکن ندی کے کنارے انہیں وضو کرتا دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے۔ انہیں وہ منظر اس قدر بھایا کہ ارشی نے اسے اپنے کیمرے کی آنکھ میں فوراً جذب کر لیا۔ پھر پھول توڑنے کا سین بھی کچھ کم نہ تھا۔ ارشی نے اس کی بھی تصویر لے لی۔ اور خاموشی سے ان کا پیچھا شروع کیا۔

" دوست یہ کیا معاملہ ہے؟ پہلے تو میں نے سمجھا تھا کہ یہ لوگ نماز پڑھنے لگی ہیں ——— لیکن یہ پھول کس مقصد کے تحت توڑے گئے ہیں۔

عابد نے ارشی کے کان میں سرگوشی کی۔

خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔

ارشی نے جواب دیا۔ وہ گھنی جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔

یہ جگہ ان کے ٹھہرنے کے مقام سے کافی فاصلہ پر تھی۔ گلبن اور عنبر

ایک اونچی سی پہاڑی کے پاس رکیں۔ یہ پہاڑی سیب اور صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ جس کے گرد بے شمار درخت اور پھولدار پودے اُگے تھے۔ جگہ جگہ انگوروں کی بیلیں زمین کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اس پہاڑی پر چڑھنے کے لئے پتھر کو کاٹ کر سیڑھیوں کا کام لیا گیا تھا۔

یہ سب آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ پہاڑی اس قدر زرخیز تھی۔ کہ کہیں سے زمین نظر ہی نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں پر بھی خود رو پھول دار پودوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اور پاؤں رکھنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ آخر یہ لوگ اوپر پہونچ گئے۔ واقعی یہاں کا نقشہ قابل دید تھا۔ گلبن کے کہنے کے مطابق سب دنگ تھے۔ یوں نظر آرہا تھا گویا قدرت نے زمین کے اس حصہ پر جنت کا کوئی ٹکڑا لا رکھا ہے۔

یہاں مکمل سکوت طاری تھا۔ عین وسط میں ایک جھونپڑی سی دکھائی دی۔ جس کو پھولدار بیلوں نے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ سرسری نظر سے دیکھنے پر وہ رنگا رنگ پھولوں کا بہت بڑا سا ڈھیر نظر آرہی تھی۔ صرف درمیان میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ جھونپڑی کے اردگرد خوشنما پھولوں کے چھوٹے چھوٹے قطعے لگائے گئے تھے۔ یہاں کے ذرے ذرے سے تقدس پھوٹا پڑتا تھا۔

یہ لوگ دم بخود سے جھونپڑی کے قریب کھڑے تھے۔ کہ کچھ آہٹ پاکر ایک ضعیف العمر انسان نے دروازے میں سے جھانکا اور اپنے سامنے ان لڑکیوں کو پاکر وہ پیچھے کو قدرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حیران ہوا۔ لیکن پھر باہر نکل آیا۔

سب نے بڑے مودبانہ انداز میں انہیں سلام کیا۔ بوڑھے شخص نے بھی اسی شفقت سے سلام کا جواب دیا۔ ان میں سے وہ گلبن اور عنبر کو پہچانتا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر یہاں آیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ یہاں کی مقامی بھی تھیں۔

سب باری باری اندر گئیں اور پھول مزار پر چڑھا کر دعا مانگ کر واپس چلی آئیں۔ لڑکے بھی ان کے پیچھے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ لوگ بہت حیران ہوئیں۔ لیکن اس مقام پر کچھ پوچھ گچھ مناسب نہ سمجھ کر وہ خاموش رہیں۔

ارشی اور اس کے ساتھی بھی اس مقام کی خوبصورتی کو بس دیکھتے رہ گئے۔

"بیٹیا! " آپ لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں؟ ۔"

بوڑھے نے ارشی کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں!

ارشی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"کیا آپ لوگ بھی زیارت کریں گے؟ "

بابا نے پھر اسی سے سوال کیا۔

"جی ضرور! "

ارشی نے جواب دیا۔

جھونپڑی کے ساتھ ہی ایک چشمہ بھی بہ رہا تھا ۔ سب نے وضو کیا اور مزار پر دعا مانگی۔

" میرا تو یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ "

ثمینہ نے ناجیہ سے آہستہ آواز میں کہا ۔ لیکن ارشی ان الفاظ کو سن چکا تھا۔

" تو کیا ارادہ ہے ۔ ان حضرت کی جگہ آپ لے لیں ۔ یہاں رہنے کا تو صرف یہ ایک ہی طریقہ ہے "

ارشی نے بھی آہستہ سے کہا ۔

ثمینہ اس کے اس انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ۔

" خدا بچائے آپ سے !

وہ صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی ۔

کچھ دیر یہاں رکنے کے بعد یہ لوگ واپس چلنے لگے ۔ بابا کو سلام کر کے بڑی آہستگی سے سیڑھیاں طے کیں ۔

" واقعی بہت پیاری جگہ ہے نا ۔ "

عابد نے تعریف کی ۔

" بھئی یہاں کے لوگ بھی تو پیارے ہیں ۔ "

عادل نے شرارت سے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا ۔ اس کا اشارہ گلبین کی طرف تھا ۔

اس میں کیا شک ہے ۔

عابد نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"اچھا! تو یہ بات ہے؟ معاملہ یہاں تک پہونچ چکا ہے؟"

ارشی نے مڑ کر عابد کی طرف دیکھا۔

لڑکیاں ان کی یہ باتیں سن کر آہستہ آہستہ مسکرا رہی تھیں اور گلبن اور عنبر ان کا مطلب سمجھ چکی تھیں۔

"سن لیا ہے نا بالو کی باتیں؟"

عنبر نے گلبن کی طرف شریر نگاہوں سے دیکھا۔

"اری! تو بھی تو یہیں رہتی ہے۔"

گلبن نے شرگیں نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہی بالو کہہ رہا ہے۔ جس سے کل تو ٹکرا گئی تھی۔ یاد ہے نا؟"

عنبر نے آہستگی سے اسے چھیڑا۔

"ہوں! لیکن شیر خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے مار ڈالے گا۔"

گلبن نے خوفزدہ سے انداز میں کہا۔ اور اس کے سامنے اپنے منگیتر کا بڑی بڑی مونچھوں اور انگاروں کی طرح سرخ آنکھوں والا چہرہ گھوم گیا۔ وہ گلبن کو شروع سے ناپسند تھا۔ لیکن اس کی مرضی کہاں چلتی تھی۔ اس کے والد نے اپنی بہن کے بیٹے سے اس کا رشتہ طے کر ہی دیا۔

کل کے اس اچانک حادثہ نے نہ جانے اسے اتنا اداس کیوں کر دیا تھا۔ اس کے معصوم سے ذہن پہ بار بار عابد کا وجیہہ چہرہ چھا

جاتا۔ اور اس وقت عابد کے الفاظ اور سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ نے
اسے اور بھی اداس کر دیا۔ باقی لوگ اس حسین راستے کی دلفریبیوں سے
لطف اندوز ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن عابد کے کان عنبر اور گلبن
کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ گلبن کے اس انکشاف پر وہ بے حد اداس
ہوگیا۔ اور باقی راستہ اس نے بڑی بے دلی سے طے کیا۔

یہ لوگ اپنے ڈیرے پر پہونچ چکے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ سورج
کی آخری نارنجی کرنیں پربتوں کی چوٹیوں اور ان پر اُگے درختوں کے
پتوں پر آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ملازم سامان
سمیٹنے لگے۔ اور کچھ دیر بعد سب کاروں میں سوار ہو چکے تھے۔ اور اس
دلفریب وادی پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے روانہ ہوئے۔

[illegible]

ناجیہ کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ادھر ارشی کا امتحان قریب تھا۔ لیکن ثمینہ کی دو ماہ کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں۔ جدائی کے خیال سے ارشی کا دل اداس ہو جاتا۔ ثمینہ کے پر زور اصرار پر ناجیہ اور ارشی نے یہ پروگرام بنایا۔ کہ یہ دونوں صرف امتحان دینے ہی گھر جائیں گے اور امتحان سے فراغت پاتے ہی واپس آجائیں گے۔

اس ہفتہ کی جدائی کے بعد ملن کے جانفزاء خیال نے ارشی اور ثمینہ کے دھڑکتے دلوں کو ڈھارس سی بندھا دی۔

ابھی سورج طلوع ہوا تھا۔ لیکن ثمینہ حسب معمول یاد الٰہی سے فارغ ہو کر سیر کے لئے تنہا جھیل کنارے چلی گئی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی سماعت کے پردوں سے کسی کے گانے کی آواز

گنگنانے لگی۔ یہ کسی مرد کی آواز تھی۔ جو اس وقت کے سکوت کو بڑے پیارے انداز میں منتشر کر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس وقت کون یہاں گا رہا ہے۔ جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔ گانے والے کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ اسے پوری طرح پہچان نہ سکی۔ کیونکہ ابھی تک رات کا اندھیرا صبح کی گود میں سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ وہ بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوہ! یہ تو ارشی ہے!"

ثمینہ اسے پہچان چکی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اور اس نے واپس جانا چاہا ——— اس وقت ان دونوں کو یہاں دیکھ کر نہ جانے کوئی کیا خیال کرے۔ اس کے ذہن نے اسے واپس چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن دل نے اس کے پاؤں میں پیار کی بوجھل زنجیر ڈال دی۔ اور وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔

ارشی گا رہا تھا۔

وہ میری طرف یوں چلے آ رہے ہیں
کہ ارماں دھڑکن سے ٹکرا رہے ہیں
جو کلیاں کھلی ہیں تو گل بھی کھلیں گے
نگاہیں ملی ہیں تو دل بھی ملیں گے
یہ سانسوں میں پیغام آ جا رہے ہیں۔
کہ ارماں دھڑکن سے ٹکرا رہے ہیں

انہیں دیکھنے کو اٹھیں میری نظریں
مجھے دیکھتے ہی جھکیں ان کی پلکیں
نہ جانے وہ کیوں مجھ سے شرمار ہے ہیں
کہ ارمان دھڑکن سے ٹکرا رہے ہیں

ثمینہ کو اس گانے کے بول بہت پسند آئے۔ ارشی گانا ختم کر چکا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک اس کی آواز کے جادو میں کھوئی تھی۔ اتنے میں کنول کا ایک بڑا سا پھول تیرتا ہوا ارشی کے قریب آکر رک گیا۔ وہ اس پھول کو دیکھ کر آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ اور اس کے سامنے ثمینہ کا تصور تھا۔ اس کی اس محویت پر ثمینہ زیر لب مسکرا کر دی۔ اور کوئی مقناطیسی کشش اسے ارشی کے قریب کھینچ لائی۔ ریشمیں سفید نائٹ گاؤن میں وہ بھی کنول کا پھول نظر آرہی تھی۔ وہ ارشی کے بالکل پاس رک گئی لیکن اسے پتہ بھی نہ چلا۔ وہ اسے اپنا تصور ہی سمجھ رہا تھا۔ ثمینہ اس کی حالت پر کھلکھلا کر ہنس دی اور ارشی اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ اس کے تصور کو زندگی مل گئی۔ وہ حیران سا چند ثانیے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"
ثمینہ بے ساختہ ہنس رہی تھی۔
"دیکھئے کیسے اتفاق کی بات ہے۔"
وہ اپنی جھینپ مٹاتا ہوا خواب کے سے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"کیا؟"
ثمینہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔
"ابھی آپ اسی صورت میں میرے تصورات کی دنیا میں تھیں۔"
ارشی پیار میں ڈوبی آواز میں اسے والہانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔
ثمینہ شرم آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی
"میرا یہ جذبہ بالکل سچا ہے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ کنول!"
ارشی نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔
ثمینہ کو ارشی کے منہ سے اپنا یہ نام کتنا پیارا لگا۔ ارشی کے ان الفاظ نے ثمینہ کو ایک انوکھی دنیا میں پہنچا دیا۔
"تم میرے پیار کا کنول ہو! ثمینہ!"
ارشی نے اس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔
ثمینہ کے لب حیا آمیز خاموشی لئے بند تھے۔ ارشی نے ہاتھ بڑھا کر پانی میں سے کنول کا سفید پھول اٹھا لیا۔
"کنول رانی!"
ارشی اس کی طرف پھول بڑھائے کھڑا تھا۔
ثمینہ نے نظر اٹھائیں۔ اور پھول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کتنا حسین ہے یہ پھول!"

ثمینہ نے کنول کے پھول کو غیر ارادی طور پر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آہستگی سے جذبات میں دبی آواز میں کہا۔

"اور کتنا خوش نصیب بھی!"

ارشی بڑی حسرت سے اس کو لبوں سے پھول لگاتے دیکھ کر بولا۔

ثمینہ اس کے کہنے کا مطلب جان کر شرما سی گئی۔ اور پھول کو اپنے ہونٹوں سے جدا کر دیا۔

"کس قدر سنگدل ہو ثمینہ۔"

ارشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کیا ہے میں نے؟"

ثمینہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے ان خوبصورت لبوں کی قربت میں یہ پھول کھل اٹھا تھا۔ لیکن تم نے اسے علیحدہ کر دیا تو کیسے مرجھا گیا ہے۔"

ارشی نے اس کے ہونٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا۔

"محبت کے کنول سدا کھلے رہتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں مرجھاتے ارشی!"

ثمینہ نے آواز میں پیار کی تمام مٹھاس سموتے ہوئے کہا اس وقت اس کی بڑی بڑی کنول جیسی آنکھوں میں پیار کے ان گنت

دیپ جل اٹھے۔

ارشی اس کی بات پر کسی قدر متاثر ہوا تھا۔

"وعدہ کرو ثمینہ کہ تم دل کے کنول کبھی مرجھانے نہ دو گی۔"

ارشی نے اس کا خوبصورت ہاتھ تھام لیا۔

اس پر ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

صبح کا اجالا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ اور مشرق کی طرف شفق کی سرخی سورج طلوع ہونے کی خبر دے رہی تھی۔

ارشی اور ثمینہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جھیل کنارے ٹہل رہے تھے۔ چاہنے والے اس خوبصورت جوڑے کو دیکھ کر کنول کے پھول مسکرا دیئے۔ اور کتنے ہی سیب کے سفید پھول گر ان کے قدم چومنے لگے۔

(۴۲)

"کنول رانی! آپ کا فون ہے۔"
ملازم لڑکے گل خاں نے ثمینہ کو اطلاع دی۔ اس وقت یہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔
"کس کا فون ہے؟"
ثمینہ نے پوچھا۔
"مدراس سے بڑے سرکار بات کر رہے ہیں۔"
گل خاں نے جواب دیا۔
ثمینہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرہ میں آئی۔
"ہلو! ابو جان! آداب!"
دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا۔

کب آ رہے ہیں؟

"اچھا آگئے ہیں؟"

تو یہاں کب آئیں گے آپ لوگ؟"

ثمینہ کی آواز مسرت سے لبریز تھی۔

"کل صبح کے جہاز سے؟"

وہ پوچھ رہی تھی۔

"تو ہم لوگ آپ کو لینے آئیں گے۔"

ثمینہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

اس کے بعد اس نے ذوالفقار علی کے پوچھنے پر ارشی اور سب کی خیریت بتائی۔ اور چند ایک دوسری باتوں کے بعد فون بند کر دیا گیا

اس کی پھوپھی کتنے سالوں بعد اپنے بچوں اور شوہر کے ہمراہ آ رہی تھی۔ انہیں دیکھنے اور ملنے کا اسے کس قدر اشتیاق تھا۔ مارے خوشی کے اس کا حسین چہرہ کندن کی طرح دمک اٹھا تھا۔

"کیا بات ہے؟ اتنی خوش نظر آ رہی ہو؟"

جب ثمینہ واپس ڈرائنگ روم میں پہونچی۔ تو سب نے اس کے چہرے سے خوشی کا اندازہ لگایا۔ سعدیہ نے اس کا سبب جاننا چاہا۔

"پھوپھی جان بمعہ اپنے بچوں کے لندن سے آگئی ہیں۔ اور کل ابو جان کے ساتھ وہ سب لوگ صبح کے جہاز سے آنے والے ہیں۔"

ثمینہ نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے جواب

"کتنے بچے ہیں تمہاری پھوپی جان کے ؟"
ناجیہ نے پوچھا۔
"دو ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ راحیل تو مجھ سے بڑے ہیں۔
زرینہ جس میری ہم عمر ہے۔" ثمینہ بڑے پیار سے اپنے پھوپھی زاد بھائی
بہن کا غائبانہ تعارف کروا رہی تھی۔ اس دوران ارشی کی نگاہیں اس
کے چہرہ کا طواف کرتی رہیں۔ نہ جانے کیوں اسے ثمینہ کا یہ انداز ناگوار
گزرا۔ وہ بے دلی سے کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔
اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"کہاں چلے ارشی بھیا!"
صدف نے اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر پوچھا۔
"بھئی! کیا کروں گا یہاں بیٹھ کر!"
اس نے ناگواری سے جواب دیا۔
ثمینہ اور باقی لڑکیاں اس کی اس بات پر حیران سی ہوئیں۔
"کھیلیں گے نہیں کیا؟"
ناجیہ نے پوچھا۔
"یہاں کھیل کون رہا ہے؟ میں تو باہر گھومنے جا رہا ہوں!"
اس نے طنز سے ثمینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور کمرہ سے
باہر نکل گیا۔

ثمینہ اس کے اس بدلے بدلے سے انداز پر حیران سی اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکی کہ کس بات پر ارسل کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔

"بھیا بھی عجیب ہیں۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے کیا ہوا کہ ہمیں بھی بیزار کر کے چلے گئے ہیں۔"

ناجیہ بھائی کی اس حرکت پر نالاں سی ہوتے ہوئے چڑ کر بولی۔

"چلو ہم لوگ تو کھیلیں۔"

صدف نے بکھرے ہوئے تاش کے پتے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں! پھر رات کو کھیلیں گے۔"

ثمینہ نے اداس لہجہ میں جواب دیا۔

"سچی ہو تم بھی! بھلا اب تمہارا دل کیوں کر کھیلنے میں لگے گا۔ بہت برے ہیں یہ ارسل بھائی۔ ہماری ثمینہ کو اداس کر کے چلے گئے ہیں۔ آ لینے دو میں بھی ایسی خبر لوں گی کہ یاد کریں گے۔"

سعدیہ نے اسے پیار سے چھیڑا۔

"نہیں یہ بات نہیں! آپا ماں سے کہہ کر ان لوگوں کے لئے ذرا کمرے درست کروا دوں۔"

ثمینہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

ثمینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آپا جی کے ساتھ کمرے ٹھیک کروانے

کے لئے جلدی۔ ناجیہ وغیرہ باہر چمن میں نکل آئیں ۔

شام کے دھندلکے گہرے ہوتے گئے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں چھپنے لگیں۔ ان کے عقب سے چاند بھی نکل آیا۔ لیکن ارشی ابھی نہیں آیا تھا۔

ثمینہ کا دل ڈوبنے لگا۔ پھوپا کے آنے کی ساری خوشی ارشی نے ختم کر دی تھی ۔

وہ برآمدے میں کھڑی ارشی کا انتظار کر رہی تھی۔ ستون سے ٹیک لگائے وہ متواتر گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کار کے ہارن کے ساتھ ہی اس کا دل دھڑک اٹھا ۔

یہ ارشی ہی کی کار تھی۔ جو اس نے عابد کے ذریعہ گھر سے منگوالی تھی۔ کار کو گیریج میں بند کر کے وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا سر جھکائے برآمدے کی طرف بڑھا۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ ثمینہ کب سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ جب وہ اس کے قریب گذرنے لگا۔ تو ثمینہ نے اسے روکا۔

"ٹھہرئیے!"

کتنی اداسی تھی اس کی آواز میں!

ارشی چونک پڑا۔ اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔

"جی! فرمائیے!"

ارشی کے لہجہ میں سنجیدگی تھی۔ جسے ثمینہ نے بھی محسوس کیا۔

"یہ آپ کو ہو کیا گیا تھا؟"

ثمینہ نے پوچھا۔

" مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہاں البتہ میں کسی کی اس قدر خوشی میں بھلا کیوں دخل انداز ہوں۔ یہ سوچ کر چلا گیا تھا۔

ارشی نے طنز بھرے انداز میں جواب دیا۔

" خوش نہ ہوتی تو کیا پھوپی جان کے آنے کی خبر پا کر روتی۔؟"

ثمینہ نے غصہ سے پوچھا۔

" بھئی اس سوال کا جواب "کل" دوں گا۔ جب کہ آپ کی خوشی انتہا کو پہونچ ہوگی۔ اس وقت مجھے جانے دیں۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔"

ارشی نے کل کے لفظ پر زور دیتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا۔

اس پر ثمینہ کو بہت دکھ ہوا۔

" آپ نہ جانے میری خوشی کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں آپ کے وہم کا کیا علاج کروں۔؟"

ثمینہ نے اس کی طرف شاکی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اور اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

اس کے ان الفاظ میں نہ جانے کون سا جادو تھا۔ کہ ارشی کا غصہ کافور ہوگیا۔ ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تو وہ تڑپ اٹھا۔

" بالکل بچی معلوم ہوتی ہو روتے ہوئے۔ ! بھئی ! میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔"

ارشی قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
"شرم تو نہیں آتی آپ کو ہنستے ہوئے!"
ثمینہ نے مصنوعی ناراضگی سے اس کی طرف دیکھا۔
"اچھا بابا آئندہ ہنسنے سے پہلے شرما لیا کروں گا۔"
ارشی نے شرارت سے کہا۔
اس کے ذہن پر سے شک کے دبیز بادل چھوٹ چکے تھے اور اب وہ ثمینہ کے ساتھ بڑے پر اطمینان انداز میں باتیں کرتا اندر داخل ہوا۔

--- --- --- --- ---

(۲۵)

آج ثمینہ کی پھوپی آنے والی تھیں۔ اور یہ سب لوگ انہیں لینے ائرپورٹ جا رہے تھے۔

ثمینہ ہلکے نیلے ریشمیں لباس میں حسن کا مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ لانبے بال دو حصوں میں بانٹ کر دو چوٹیوں کی شکل میں گوندھ دیئے گئے تھے جو اس کی پشت پر ناگوں کا سا بل کھاتا جوڑا معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کا حسن آج ایک نرالے روپ میں ارشی کے سامنے تھا۔ اس کی نگاہیں ثمینہ کے خوبصورت سراپا کا بار بار طواف کر رہی تھیں۔ وہ بھی تو اس گرے پتلون اور چیک کوٹ میں کافی وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اور ثمینہ برآمدے میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے باقی لڑکیوں کے منتظر تھے ارشی کی نگاہیں محبت کے سوز سے لبریز تھیں۔ اور بے چاری ثمینہ

ان نظروں کی تاب نہ لاکر گھبرا رہی تھی ۔

" نہ جانے یہ لوگ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں ۔" ثمینہ کلائی سے بندھی گھڑی پر نظریں جمائے بولی۔ اصل میں وہ تو اس کی نگاہوں سے گھبرا رہی تھی۔ لیکن ارشی نے اس کا مطلب غلط لیا ۔

" انتظار کی گھڑیاں بہت کٹھن ہوا کرتی ہیں ثمینہ !"

ارشی کے انداز میں طنز زیادہ تھا ۔

"کیا مطلب ؟"

ثمینہ اس کی آواز میں طنز کا زہر محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھ کر رہ گئی ۔

" میرا مطلب ہے کہ ابھی تو جہاز اترنے میں پورے دو گھنٹے ہیں ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔"

ارشی کا انداز وہی تھا ۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں ۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا ۔"

ثمینہ کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے ۔

" میں کل سے تم میں ایک تبدیلی پا رہا ہوں ثمینہ !"

ارشی کی آواز اداس تھی۔

"کیسی تبدیلی ؟"

ثمینہ قدرے حیرت سے پوچھ رہی تھی ۔

"یہی کہ اب تم مجھ سے کترانے لگی ہو ۔"

ارشی بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

ثمینہ کے انداز میں تڑپ تھی۔

سچ کہہ رہا ہوں۔

ارشی نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا اپنا خیال ہے!۔"

ثمینہ نے اس کے دل سے شک دور کرنا چاہا۔

"پریشان نہ ہو ثمینہ! میں تو جلد ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

ارشی کی آواز میں دکھ تھا۔

اس کے ان الفاظ پر ثمینہ نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں شکائت بھی تھی۔ اور التجا بھی لیکن بدگمانی نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ اسی لئے اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔

"آپ اس طرح کریں گے تو میں ائرپورٹ بھی نہیں جاؤں گی۔"

ارشی کی باتیں سن کر وہ رونے کے قریب تھی۔

"یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔"

وہ کندھے جھٹک کر بولا۔

ثمینہ وہاں سے اٹھ کر جانے ہی لگی تھی۔ کہ دوسری لڑکیاں آگیئں اور ان دونوں کے چہروں پہ ناراضگی دیکھ کر وہ لوگ کچھ نہ سمجھ

سکیں۔

"کیا بات ہے ثمینہ؟"

ناجیہ اس کے قریب رکتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس لئے میں نہیں جا رہی آپ لوگ ان کے ساتھ چلی جایئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو کافی وقت ہے۔ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ تمہاری طبیعت بحال ہو جائے تو سب چلتے ہیں۔ وہ لوگ برا محسوس کریں گے۔"

ناجیہ نے پیار سے اس کی دراز چوٹیوں سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی تو تم اچھی بھلی تھیں۔ ضرور ارشی بھیا کے ساتھ کچھ جنگ ہوئی ہے۔"

صدف نے ارشی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ تو وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"ان کے موڈ کو کل سے کچھ ہوا ہے۔ ہر ایک سے لڑائی لیتے پھر رہے ہیں۔ صبح میں نے ٹائی پر استری کرنے میں ذرا دیر کیا کی ہے کہ مجھ پر ہی برس پڑے۔"

ناجیہ نے پیار اور شکایت آمیز انداز نگاہوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"خدا خیر کرے ارشی بھیا تو لڑاکے ہوتے جا رہے ہیں۔"

سعدیہ نے بھی فقرہ کسا۔
"بھئی! ہم تو چلے! یہاں تو سب ہی لڑنے کے موڈ میں ہیں۔"
ارشی نے کنکھیوں سے ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"چلئے! سیدھی طرح کار میں۔ ورنہ چچا حضور سے آپ کی ایسی۔۔۔
شکائیتیں کروں گی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔
ناجیہ نے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹتے ہوئے دھمکی دی۔
اس کے اس انداز پر سب لوگ ہنس دیئے۔ ثمینہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ان سب نے اسے چلنے پر مجبور کر ہی دیا۔
یہ سب لوگ کار میں بیٹھ گئیں اور ارشی نے کار اسٹارٹ کر دی
تمام راستہ وہ خاموش سا رہا۔ آخر یہ لوگ ائیرپورٹ پہنچ گئے۔

---

(۲۶)

فضا میں جہاز کی آمد سے گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوگئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ائر انڈیا کا فوکر فرینڈشپ طیارہ ائرپورٹ پر اتر آیا۔

یہاں کافی ہجوم تھا۔ ثمینہ وقتی طور پر سب کچھ بھول کر آنے والوں کو دیکھنے کے لئے بے تاب سی نظر آنے لگی۔ مگر ارشی کی نظریں اس کے چہرہ پر لگی تھیں۔

جن شکوک کو اس نے راستہ بھر تھپک کر سلایا تھا۔ وہ پھر اس کے دل و دماغ میں سر اٹھانے لگے۔

جہاز پر ایک چھوٹی سی سیڑھی لگا دی گئی۔ ائر انڈیا کی خوبصورت فضائی میزبان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑے پیارے انداز میں سر کے ہلکے سے خم سے جانے والوں

کو خدا حافظ" کہہ رہی تھی۔ ہر بار مسکرانے سے اس کے سفید خوبصورت سڈول دانت چمکنے لگتے۔ سب سے آخر میں ذوالفقار علی نظر آئے۔ اور ان کے ساتھ ہی ان ہی کی ہم عمر ایک انگریزی وضع قطع کے صاحب تھے ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور ایک حسین وجمیل سی لڑکی اور اس کے پیچھے ایک دراز قد لڑکا اتر رہے تھے۔ ذوالفقار علی نے ثمینہ اور ان سب کی طرف ہاتھ ہلایا۔ اور جواب میں ان سب نے ہی ہاتھ لہرائے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ چلتے ان کے پاس پہونچ گئے۔ ان سب نے انہیں سلام کیا۔

"یہ ثمینہ ہے۔"

ذوالفقار علی نے بڑے فخر و پیار بھرے انداز میں اپنی بیٹی کا تعارف کروایا۔

"ماشاء اللہ کتنی پیاری بچی ہے۔"

آصفہ بیگم نے ثمینہ کو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ان کے شوہر کرنل وسیم نے بھی بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد نرجس اس سے پیار سے ملی۔ راحیل خاموشی سے اپنی باری کا منتظر تھا۔ ذوالفقار علی نے ثمینہ سے تعارف کروایا۔

"ان سے ملو بیٹی۔ یہ تمہارا پھوپھی زاد بھائی راحیل ہے۔"

ثمینہ جو راحیل سے ملنے پر قدرے ہچکچا رہی تھی۔ اپنے والد کی آواز پر چونک کر راحیل کی طرف دیکھنے لگی۔

راحیل کی شخصیت کتنی پرکشش تھی۔ سفید رنگت، سیاہ گھنگھریالے بال اور اداسی آنکھیں، ہلکے سرمئی سوٹ میں وہ کافی شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ ذوالفقار کے تعارف کروانے پر اس نے بڑے مہذب انداز میں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے سر کے ہلکے سے خم کے ساتھ ثمینہ کو سلام کیا۔ اس کا یہ انداز خالص مشرقی تھا۔

کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے زندگی کی پچیس بہاریں مغرب میں گذاری ہیں۔ نرجس کے اطوار سے بھی مشرقیت کا انداز ٹپکا پڑتا تھا ثمینہ چند سکنڈ کے لئے کسی سوچ میں پڑ گئی۔

ذوالفقار علی نے ارشی اور دوسری لڑکیوں کا تعارف بھی کروایا یہ لوگ آپس میں مل کر رسماً ہی نہیں واقعی بہت مسرور نظر آ رہے تھے سامان وغیرہ نکلوانے کے بعد یہ لوگ ائیرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ جہاں ارشی کی موٹر کے علاوہ ثمینہ کے زیر تصرف کار بھی کھڑی تھی۔ ثمینہ آنے سے قبل ڈرائیور کو ائیرپورٹ آنے کی ہدایت کر کے آئی تھی۔

محض اتفاق سے یا ارشی کے شک کو موقع ملنا تھا۔ کہ ثمینہ کو ارشی کی کار میں جگہ نہ مل سکی۔ اور اسے راحیل کے برابر بیٹھنا پڑا۔ وہ بیچاری کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی۔ راحیل خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ ثمینہ نرجس سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن اس کا دل و دماغ ارشی کی طرف تھا۔

" نہ جانے وہ کیا خیال کرے گا۔ پہلے ہی اس کے دل میں کوئی

بات ہے ۔"

نرجس سے باتیں کرتے کرتے وہ خاموش سی ہو جاتی۔ ارشی اتنی تیز کار چلا رہا تھا۔ کہ ان کی کار بہت پیچھے رہ گئی ۔ ثمینہ اس کی وجہ بھی جان چکی تھی ۔

"ارشی کو مجھ پہ غصہ آرہا ہوگا ۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور؟

ثمینہ دکھی دل سے سوچ رہی تھی ۔

دوپہر تک یہ لوگ گھر پہونچ گئے ۔ گلازمین سامان اتارنے لگے اور یہ سب اندر آگئے ۔ ثمینہ نے سب کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ۔

نوکروں نے سارا سامان ثمینہ کی ہدایت کے مطابق ان کے کمروں میں پہنچا دیا ۔

یہ لوگ اطمینان سے باتیں کر رہے تھے ۔

"بہت گرم ہے یہ ملک !

آصفہ بیگم نے کرسی پہ پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں ! آپ لوگ تو سرد ملک میں رہنے کے عادی ہیں۔ اس لئے آپ کو یہاں کی گرمی ناقابل برداشت ہوگی ۔ تاجیہ نے ان کی بات کا جواب دیا۔

یہاں تو پھر بھی قدرے موسم خوشگوار ہے ۔ مدراس میں تو جیسے آگ برس رہی ہے ۔

نرجس نے اپنی خوبصورت پیشانی پر سے پسینہ کے قطرے

صاف کرتے ہوئے کہا۔

ارشی کھڑکی کے قریب والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے پار نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ ثمینہ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتی۔ راحیل سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کسی انگریزی رسالہ کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔

کرنل وسیم بڑے زندہ دل الشان معلوم ہوتے تھے۔ سب ان کی باتیں بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے۔

باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع کی۔

"چلئے بھئی! ہمارے پیٹ میں تو بھوک سے چوہے کود رہے ہیں۔"

کرنل وسیم پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر بولے۔ ان کی اس بات پر سب مسکرا دیئے۔ اور کھانا کھانے ڈائننگ روم کی طرف بڑھے۔

(۲۷)

ارشی بیٹا! مجھ سے وعدہ کرو کہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی تم دونوں یہاں آجاؤ گے۔"

ذوالفقار علی جو اس تھوڑے سے عرصے میں ان دونوں بھائی بہن کو اولاد کی طرح چاہنے لگے تھے۔ اس وقت ارشی کے منہ سے جانے کے متعلق سن کر اداس سے ہو گئے۔ اور اسے جلد لوٹ آنے کی تاکید کر رہے تھے۔

اس وقت یہ سب لوگ چمن میں بیٹھے تھے۔ آصفہ بیگم اور کرنل وسیم کو ارشی بہت پسند آیا تھا۔

"ہاں بیٹے چلے آنا۔ وہاں تم لوگ اکیلے کیا کرو گے۔"

آصفہ بیگم جنہیں ثمینہ کی زبانی ان کے حالات کا علم ہو چکا تھا۔ اسے پیار سے دیکھ کر بولیں۔

"جی بہت اچھا!"
ارشی نے جواب دیا۔
ثمینہ اس کے جانے کا سن کر چپ سی رہ گئی۔ اسے تو ارشی کی پل بھر کی دوری گوارہ نہ تھی۔ کہاں وہ دس بارہ دنوں کے لئے جا رہا تھا اسے آج سے دو دن پہلے کی بات یاد آ گئی۔ جب ارشی شام کے وقت نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اور وہ کس قدر بے چین سی ہو گئی تھی۔
وہ اس وقت بالکل خاموش تھی۔ ارشی اس سے کھنچا کھنچا سا بھی تو رہنے لگا تھا۔ نہ جانے اس نے اپنے دل میں اس کے متعلق کیا سوچ رکھا تھا۔ ثمینہ بالکل نہ جان سکی۔ وہ چند روز سے ارشی کے بدلے ہوئے رویہ سے عاجز تھی۔ وہ جب بھی اس سے کوئی بات کرتی۔ ارشی طنز سے بھرپور جواب دیتا۔ اور کل وہ جا رہا تھا۔ اس خیال سے ثمینہ کا دل ڈوب سا گیا۔ لیکن وہ اسے روک بھی نہ سکتا تھا۔ یہ اس کے مستقبل کا سوال تھا۔

ادھر ناجیہ راحیل سے کافی متاثر ہو چکی تھی۔ یہ خاموش طبع سا نوجوان اس کے خیالوں کی دنیا میں آ گیا تھا۔ ہر لمحہ سوچوں میں ڈوبا۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے وہ کتنا پر وقار نظر آتا۔ دو دن ہی میں ناجیہ اسے اس قدر چاہنے لگی تھی۔ کہ اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن راحیل اس کی ان سوچوں سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ شروع سے ہی سنجیدہ اور تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ لندن کے آزاد ماحول میں رہنے کے باوجود

وہ ہر قسم کی برائی سے پاک تھا۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور آج کل وہاں کی ایک بہت بڑی فرم میں جنرل مینجر تھا۔ اب تک پورے یورپ اور کئی دوسرے ممالک کی سیر کر چکا تھا۔

اچھے انگریز شعراء اور ادیبوں کی باتیں پڑھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی لئے اس نے گھر میں بہت بڑی لائبریری بنائی تھی۔ ابھی تک وہ پیار و محبت کے روگ سے بچا ہوا تھا۔ اس معاملہ میں اس کا خیال انوکھا تھا۔ کہ اس لڑکی سے محبت کرے گا۔ جو اس سے نفرت کرتی ہو۔ لیکن آج تک کوئی لڑکی بھی اس سے نفرت نہ کر سکی۔ یورپ کے آزاد ماحول میں اسے ہزاروں لڑکیاں ملیں۔ ان میں سے کئی اس پر مرمٹنے کو تیار تھیں۔ لیکن وہ ہمیشہ ان سے محض ایک دوست بن کر ملا۔ اسے اپنے آئیڈیل کی تلاش تھی۔ جو یورپ میں نہ مل سکا۔ اس کی ماں اکثر ثمینہ کا ذکر کیا کرتی۔ جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کا ذکر سن کر اکثر اس کے متعلق سوچنے لگتا۔ جانے وہ کیسی ہوگی؟ شائد وہ بھی ان عام لڑکیوں کی طرح دیکھتے ہی اسے پسند کرنا شروع کر دے؟ اور یہ سوچ کر وہ نہ جانے کیوں بیزار ہو جاتا۔

"شائد سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں یا ہو سکتا ہے۔ مشرق میں ایسا نہ ہوتا ہو؟۔"

نرجس کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اس کی شادی ثمینہ سے ہوگی۔ اور اسی لئے یہ لوگ ہندوستان جا رہے ہیں۔ لیکن راحیل

نے تو کبھی شادی کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔" ہو سکتا ہے ثمینہ میرے معیار پر پورا نہ اترے۔"

وہ تو اپنی اوتکھی آئیڈیل لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

آخر یہ لوگ ہندوستان آہی گئے۔ اور ثمینہ کو دیکھ کر راحیل کے دل میں دبی دبی سی آگ سلگنے لگی۔ اسے یہ مشرقی لڑکی بہت پیاری لگی تھا یہ معصوم اور سادہ حسن یورپ میں کہاں ملتا۔ ثمینہ کتنی آہستگی سے راحیل کے دل میں داخل ہو چکی تھی۔ لیکن راحیل نے اپنے جذبات اس پر ظاہر نہ ہونے دیئے۔ وہ بظاہر لاتعلق سا بنا رہتا۔ لیکن ثمینہ کی موجودگی میں وہ خود کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتا۔ چند ہی دنوں میں وہ ثمینہ کو کس قدر چاہنے لگا تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کے مقابلہ میں اسے ایک الگ مقام پر نظر آتی تھی۔ اس دوران ثمینہ نے اسے صرف دو تین دفعہ مخاطب کیا تھا۔ اور ثمینہ کا یہ انداز اسے بہت پسند آیا تھا وہ کتنی پر وقار تھی۔ راحیل سوچنے لگتا۔

کئی مرتبہ اس نے نوٹ کیا تھا۔ کہ ارشی بڑے پیار سے ثمینہ کو دیکھ رہا ہوتا۔ لیکن برا ماننے کی بجائے وہ اپنی آئیڈیل پر فخر محسوس کرتا۔ " یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو وہ پسند کرتا ہو دوسرا اس کو نہ دیکھے یا اسے پسند نہ کرے۔ ہر ایک کو اپنی پسند پر اختیار ہے۔" اور یہ سوچ کر وہ مسکرا دیتا۔

ارشی اسے بہت اچھا لگا۔ اور چند روز میں راحیل اس سے

کافی گھل مل گیا۔ لیکن ارشی کبھی کبھی اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا
اسے راحیل سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔ لیکن راحیل اپنی انوکھی طبیعت
کی وجہ سے اس کے جذبات کو سمجھ نہ سکا۔

--- ---

(۲۸۱)

آج ارشی اور ناجیہ وادی زمرد کو خیر باد کہنے والے تھے۔ ثمینہ صبح سے بہت اداس تھی۔ ارشی اور ناجیہ بھی کچھ کم اداس نہ تھے۔
چند دن سے ارشی کے دل میں یہ خیال ابھر رہا تھا۔ کہ وہ ثمینہ کو نہ اپنا سکے گا۔ اور اپنے دل کی اس آواز پر وہ تڑپ اٹھا۔
"ثمینہ کو میں نے چاہا ہے وہ اب کسی اور کی نہیں بن سکتی۔ میرے ہوتے یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ کوئی اور اسے اپنا لے۔ وہ میرا حق ہے۔ میں اس حق کو حاصل کر کے رہوں گا۔"
یہ سوچ کر اس کا خون کھول سا اٹھا۔
اور اگر ثمینہ اسے خود چھوڑنا چاہے تو؟
اس کے دماغ نے سوال کیا۔

"میں اسے ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا ۔ وہ میری غیرت کا امتحان نہیں لے گی ۔ اور اگر اس نے ایسے حالات پیدا کر ہی دیئے تو اس دیوار کو گرانا بھی جانتا ہوں ۔ جو وہ اپنے اور میرے درمیان پیدا کرنا چاہے گی ———— "

ارشی کے جذبات میں طوفان سا اٹھ رہا تھا ۔ اس کے سامنے راحیلہ کا چہرہ بار بار گھوم رہا تھا ۔

اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا ۔ کہ وہ ثمینہ سے آج آخری بار پوچھ لے گا کہ اس کا کیا ارادہ ہے ۔

ان کے جانے میں ابھی دو تین گھنٹے باقی تھے ۔ وہ کچھ سوچتا ہوا کمرہ سے نکلا ۔ ثمینہ کا کمرہ اس کے کمرے سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہ تھا وہ ثمینہ کے کمرہ کے باہر ٹھہر گیا ۔ پھر پردے ہٹا کر اندر داخل ہوا ۔ ثمینہ دروازے کی طرف پشت کئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی ۔

"میں جا رہا ہوں ثمینہ ! "

ارشی اس کے قریب رکتے ہوئے اداس آواز میں کہہ رہا تھا ۔

ثمینہ اس کی آواز پر چونک پڑی اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی ۔ ارشی نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے ۔

"تم رو رہی ہو ؟ "

ارشی کی آواز میں کتنا درد تھا ۔

"اس وقت بھی آنے کی زحمت کیوں کی ؟ "

ثمینہ کے انداز میں گلہ تھا۔ ارشی اس کا مطلب جان چکا تھا وہ خود اپنے دماغ پر حیران تھا۔ کہ بعض اوقات اسے کیا ہو جاتا ہے ۔!

ورنہ یہ حقیقت تھی کہ وہ ثمینہ کو واقعی والہانہ انداز میں چاہتا تھا۔ شائد یہ ثمینہ سے دوری کا احساس تھا جس نے چند روز سے اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ لیکن اس وقت ثمینہ کی حالت دیکھ کر اس کے دل و دماغ کے تمام شکوک و شبہات جاتے رہے ۔

"مجھے معاف کر دو ثمینہ ! میں نے واقعی تم سے زیادتی کی لیکن اس کے باوجود بھی میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں ۔"

ارشی اس کے کندھے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز اور اس کی آنکھیں اس کے کہنے کی صداقت کا ثبوت دے رہی تھیں ۔

ہیلئے ! آپ تو جیسے کسی ڈرامہ کا مکالمہ دوہرا رہے ہیں۔ ثمینہ مصنوعی خفگی سے بولی ۔

"کاش ! میں تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا سکتا ! "

ثمینہ کے الفاظ پر ارشی دکھی آواز میں بولا۔

"آخر ! یہ آپ کو ہو کیا جاتا ہے ؟ "

ثمینہ اس کے چند دن پہلے کے رویہ کی طرف اشارہ کر رہی

تھی۔

"بس ذرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔"

ارشی نے کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور؟"

ثمینہ نے معصومیت سے کہا۔

"اس قصور کی سزا ابھی تمہیں ملنے والی ہے؟"

ارشی شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"وہ کیا!"

ثمینہ نے حیرت سے کہا۔

"تمہیں جلد ہی اپنانے والا ہوں۔

ارشی اس کی جھکی جھکی آنکھوں میں جھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

سنو ثمینہ! ایک وعدہ کرو گی۔"

ارشی اس کا جھکا ہوا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں!

ثمینہ کی آواز شرم کے بوجھ سے دبی تھی۔ میں نے عہد کیا ہے کہ میں تمہیں ہر قیمت پر اپناؤں گا۔ امتحان سے فارغ ہو کر ناجیہ تمہارے ابو سے تمہیں میرے لئے مانگ لے گی۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس

سے انکار نہیں کریں گے۔

"لیکن تم سے التجا ہے کہ تم نہ بدل جانا۔ یہ بات میری برداشت سے باہر ہوگی۔ میں اپنی محبت کی توہین ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ کسی اور کو چھیننے نہ دوں گا۔ وعدہ کرو ثمینہ کہ تم اس محبت کو میری امانت سمجھوگی اور میرا انتظار کروگی۔

ارشی یہ الفاظ وارفتگی کے عالم میں کہے جا رہا تھا۔ اور ثمینہ متحیر سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ کو مجھ پہ کوئی شک ہے۔ کہ میں آپ کے علاوہ کسی اور کو ...."

ثمینہ کو ارشی کی ان باتوں سے بہت دکھ پہونچا تھا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"تم پر تو اعتبار ہے لیکن دنیا پر نہیں۔"

اس لئے میں نے تمہیں ہوشیار رہنے کے لئے کہا ہے۔"

ارشی نے اس کا نازک ہاتھ پیار سے دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں ثمینہ! وہ کل عجیب طرح تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔"

ارشی ناگواری سے کہنے لگا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو انہیں بھائی سمجھتی ہوں۔"

ثمینہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"بات تو جب ہے کہ وہ بھی تمہیں بہن سمجھتا ہو۔ لیکن افسوس کہ

انداز عجیب سا محسوس ہوتا ہے مجھے ۔"

ارشی نے جواب دیا۔

"توبہ! آپ تو بہت بدگمان ہیں!"

ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب تم قریب آجاؤگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ارشی نے اس کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس پر ثمینہ لجا کر رہ گئی۔

باتوں میں دونوں کو وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ ارشی کو ثمینہ

کے پاس تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔

"اچھا سپرد خدا میری زندگی!"

ارشی نے اس کے نازک ہاتھ پر محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے

پیار سے کہا۔ اس کے یوں کہنے پر ثمینہ پھر اداس ہوگئی:

"کب آئیں گے؟"

ثمینہ کے انداز میں بے چینی نمایاں تھی۔

"بہت جلد!"

ارشی نے اسے تسلی دی۔ اور باہر نکلنے لگا۔

خدا حافظ!

ثمینہ نے آنسوؤں کے بوجھ تلے دبی آواز میں کہا۔ اس کا ارشی

جا چکا تھا۔ وہ رونے لگی۔

ثمینہ سے رخصت ہوکر وہ برآمدے میں آیا۔ جہاں سب لوگ کھڑے تھے۔

سامان کار میں رکھا جاچکا تھا۔

ناجیہ تھوڑے ہی دنوں میں سب سے کافی مانوس ہوگئی تھی اور پھر اب تو اس کے دل کا مسئلہ بھی تھا۔ اس لئے وہ بھی قدرے اداس نظر آرہی تھی۔

تھوڑی دیر میں ثمینہ بھی وہاں آگئی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ سب نے یہ محسوس کیا۔

ارشی اور ناجیہ سب سے رخصت ہونے کے بعد کار میں بیٹھ گئے۔ اور بڑی بے دلی سے روانہ ہوئے۔ کار آہستہ آہستہ گیٹ سے نکل رہی تھی۔

ثمینہ یوں جاتے نہ دیکھ سکی اور جلدی جلدی قدم اٹھاتی اپنے کمرہ میں آئی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔

-----:-----

(۲۹)

ثمینہ کی دنیا اداس کر کے ارشی جا چکا تھا۔ اس کو گئے آج دوسرا روز تھا۔ ثمینہ کا دل کسی بات میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بہت کم اپنی سہیلیوں اور اپنی پھوپھی کے پاس بیٹھی۔ اس کا زیادہ وقت یا تو چمن میں ٹہل کر یا جھیل کنارے بیٹھ کر گزر جاتا۔ اس طرح ارشی تصورات میں اس کے پاس ہوتا۔ اس کی یہ حالت کسی بھی پوشیدہ نہ تھی یہاں تک کہ اس کے والد نے بھی نوٹ کیا۔ اور وہ ثمینہ کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اس نتیجہ پہ پہنچ چکے تھے۔ کہ جلد ہی وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اسی دوران ان کی بہن نے بھی اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ کہ وہ ثمینہ کو مانگنے کے سلسلہ ہی میں آئی ہیں۔ اور اپنی بہن کے منہ سے یہ بات سن کر ذوالفقار بہت خوش ہوئے۔ لیکن

اس معاملہ میں وہ ثمینہ سے پوچھ لینا مناسب سمجھتے تھے۔

خود انہیں تو راحیل بہت پسند آیا تھا۔ اور پھر وہ ان کی بہن کا خون تھا۔ وہ راحیل سے ثمینہ کی شادی کر دینے پر پوری طرح رضامند ہو گئے۔ اس کو تو وہ اپنی خوش قسمتی تصور کرتے تھے۔ کہ انہیں اتنا اچھا لڑکا مل گیا ہے۔ اب وہ اس سوچ میں تھے۔ کہ ثمینہ کا عندیہ کیسے لیا جائے۔ اور آخر ان کے ذہن میں ایک بات آہی گئی۔ اس موقعہ پر ثمینہ کی کئی ایک سہیلیاں موجود تھیں۔ انہوں نے سعدیہ کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔

اتنا چاہنے والا باپ بیٹی کے دل کا اصل روگ نہ جان سکا۔ اور اس کے دکھ کا غلط علاج کرنے والا تھا۔ جو اس کے مرض کو بڑھانے کے لئے بلکہ اس کو موت سے ہمکنار کرنے کے لئے کافی تھا۔ ——

اس وقت ذوالفقار علی اپنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سعدیہ کو بلوایا۔ جب ملازم اسے بلانے گیا۔ تو وہ ثمینہ سے باتوں میں مشغول تھی۔

"خدا خیر کرے چچا جان نے کس لئے بلایا ہے۔"

سعدیہ قدرے حیران سی ثمینہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ثمینہ کا دل اندر ہی اندر بیٹھ سا گیا۔

تم گھبراؤ نہیں۔ شاید کوئی کام ہو۔

سعدیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

نہیں سعدیہ! نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔

ثمینہ کا چہرہ اور بھی اداس ہو گیا۔

"اچھا تو میں جا رہی ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا۔ دیکھو پریشان نہ ہونا۔"

سعدیہ دروازہ میں سے نکلتے ہوئے اسے تاکید کر رہی تھی۔

ثمینہ بے بسی کے عالم میں اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔ اور دیوانہ وار کمرہ میں ٹہلنے لگی۔

وہ ابھی اسی حالت میں ٹہل رہی تھی کہ اسے راحیل کی آواز نے چونکا دیا۔

"کیا میں آسکتا ہوں؟"

وہ دروازے ہی میں کھڑا ہوا اجازت مانگ رہا تھا۔

ثمینہ اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر کچھ اور بھی پریشان سی ہو گئی۔ اسے راحیل کا یوں اپنے کمرے میں چلا آنا بہت ناگوار گذرا۔

"کیوں کیا بات راحیل بھائی۔"

وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں تمہارے لئے یہ پھول لایا تھا۔ سنا ہے تمہیں پھول بہت پسند ہیں۔"

راحیل ہاتھ میں بڑے بڑے گلاب کے مسکراتے ہوئے شگفتہ

پھولوں کا گلدستہ پکڑے نے اس سے مخاطب تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر موجزن تھا۔

"آپ نے ناحق اتنی زحمت گوارا کی۔ میرے پاس تو پہلے ہی اتنے سارے پھول ہیں۔ انہیں لے کر کیا کروں گی۔"

ثمینہ نے اس کی آنکھوں میں امنڈتے پیار کو نظرانداز کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

وہ تو راحیل کو ایک خاموش طبع اور سنجیدہ مزاج نوجوان سمجھ کر اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ لیکن شائد اس نے ثمینہ کے اس سلوک کو کسی اور نظر سے دیکھا۔

راحیل ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ثمینہ کے خوبصورت چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس روپ میں ثمینہ اس کو اور بھی اچھی معلوم ہوئی۔ وہ مسکراتا رہا۔ اور ثمینہ اس کے یوں مسکرانے پر اور بھی جل گئی۔ لیکن منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو ثمینہ!"

راحیل نے بڑے پرسکون انداز میں پوچھا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ سے ناراض ہونے کی۔"

ثمینہ نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"اچھا میں جا رہا ہوں۔ اگر تمہارے ان نازک ہاتھوں کو تکلیف نہ ہو تو ان پھولوں کو اٹھا کر باہر پھینک دینا۔"

راحیل کے خولصورت ہونٹوں پر اب بھی وہی دلکش مسکراہٹ تھی۔ پھولوں کا گلدستہ کمرے کی دہلیز کے پاس گر کر بکھر چکا تھا۔ اور پھول اپنی اس بے قدری پر مرجھا سے گئے۔

ثمینہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور وہ سگریٹ سلگاتا ہوا چلا گیا ثمینہ کو اس کی اسی قسم کی بے تکلفی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس کے سامنے ارشی کا چہرہ تھا۔ اور اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے ——————" وعدہ کرو ثمینہ کہ تم محبت کو میری امانت سمجھوگی۔ اور میرے آنے کا انتظار کروگی۔"

"ہاں! ارشی دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھے تم سے نہ چھین سکے گی۔ میں تمہاری ہوں اور سدا تمہاری رہوں گی!"

وہ ارشی کے تصور سے مخاطب تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اور آنسو اس کے حسین رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

وہ بڑی بے قراری سے سعدیہ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ آخر پردے ہلے اور سعدیہ اس کے پاس تھی۔ اس کے چہرے پر تفکرات کے گہرے بادل چھا رہے تھے۔ ثمینہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ پریشان اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم بولتی کیوں نہیں سعدیہ! کیا کہا ابو حضور نے؟"

ثمینہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا بتاؤں ثمینہ!"

۔ سعدیہ دکھ سے بولی ۔

" خدا کے لئے جلدی بتاؤ ! "

ثمینہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی ۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا ۔

انہوں نے مجھے اس لئے بلوایا تھا کہ میں ایک رشتے کے بارے میں تمہاری رائے معلوم کر کے انہیں بتاؤں ۔ "

سعدیہ نے بتایا ۔

" کیسا رشتہ ؟

ثمینہ نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا ۔

" تمہاری پھوپھی نے اپنے بیٹے کے لئے تمہیں مانگا ہے ۔ اور چچا حضور نے انہیں اپنی رضامندی دے دی ہے ۔ راحیل انہیں بہت پسند ہے اور وہ مستقبل قریب میں تمہارے اس فرض سے ہو جانا چاہتے ہیں ۔ "

سعدیہ نے بات کرتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا ۔

ثمینہ کی حالت قابل دید تھی ۔ سعدیہ کی زبانی اپنے باپ کے خیالات سن کر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا ۔

اگر سعدیہ اسے سہارا نہ دیتی تو وہ زمین پر گر جاتی ۔

" خود کو سنبھالو ثمینہ ! "

سعدیہ اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا سی گئی ۔ اسے اپنی اس بے بس سہیلی پر ترس آنے لگا ۔

"سعدیہ! ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں اپنی زندگی کے بدلے بھی ابو کو ایسا نہ کرنے دوں گی۔"

ثمینہ روتے ہوئے بولی۔

"میں نے چچا حضور کو تمام حالات بتائے ہیں۔"

سعدیہ نے بتایا

"تو ابو جان کیا کہتے ہیں؟" ثمینہ نے جلدی جلدی سے پوچھا۔

انہیں خود افسوس ہے۔ کہ ارشی نے ایسا کرنے میں دیر کی۔ اگر انہیں پہلے علم ہوتا۔ تو وہ اپنی بہن سے وعدہ نہ کر لیتے۔

"لیکن اب ارشی کا سوال پورا کرنا مشکل ہے۔ وہ تو اس معاملہ میں انتہائی سخت گیر دکھائی دیتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ ثمینہ کو ان کی عزت کے لیے سب کچھ کرنا پڑے گا۔"

سعدیہ نے بڑے دکھی انداز میں ذوالفقار علی کی تمام باتیں ثمینہ کو بتا دیں۔

"میں مر جاؤں گی سعدیہ!"

ثمینہ نے بلکتے ہوئے بے بسی سے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا —

"چپ ہو جاؤ ثمینہ! آؤ اس سے متعلق کچھ سوچیں۔ اگر تم یوں ہی روتی رہیں اور مجھے بھی پریشان کر دیا۔ تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔"

سعدیہ نے اس کے آنسو دوپٹہ کے آنچل میں جذب کرتے ہوئے

اسے چپ کرانا چاہا۔ اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
کمرہ میں ثمینہ کی سسکیوں نے ایک اداس سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔
اتنے میں صدف کمرے میں داخل ہوئی۔ اور ثمینہ کو روتا دیکھ کر وہ بات
سمجھ گئی۔ کیونکہ ابھی ابھی نرجس نے بھی اسے ثمینہ اور راحیل کے رشتہ کے
متعلق بتایا تھا۔ یہ سن کر وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ اور اب ثمینہ اور سعدیہ
کو تلاش کرتی ثمینہ کے کمرے میں چلی آئی۔ نرجس اس وقت غسل کرنے
میں مشغول تھی۔ اور آصفہ بیگم اپنے شوہر کرنل وسیم اور ذوالفقار علی کے
ساتھ باہر چمن میں تھیں۔

"باجی! خدا کے لئے نہ روئیے!"

صدف بھی اسے تسلی دے رہی تھی۔

تمہیں کچھ معلوم ہوا ہے۔

سعدیہ نے صدف سے سوال کیا۔

ہاں نرجس نے بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ اس قدر خوش ہے کہ میں
بیان نہیں کر سکتی۔"

صدف نے بتایا۔

"سعدیہ باجی! آپ ہی سمجھائیے چچا حضور کو! وہ کیا کرنے والے
ہیں۔۔۔؟"

صدف نے سعدیہ کو دہائی دی۔

"سب کچھ بتایا ہے۔ وہ تو اپنی ضد پر قائم ہیں۔"

سعدیہ نے جواب دیا۔

" اچھا تو آپ نے ارشی بھیا کے متعلق بتایا ہے؟ "

صدف پوچھ رہی تھی۔

" ہاں! "

سعدیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

" ارشی کو چاہیئے تھا۔ کہ وہ ناجیہ کے ذریعہ کافی پہلے ہی رشتہ مانگ لیتا۔ اس نے بڑی زبردست غلطی کی۔ "

سعدیہ نے افسوس ناک سے انداز میں کہا۔

" آپ کو معلوم نہیں کہ ناجیہ کس لیئے ہمارے ہاں گئی تھی۔ "

صدف نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" نہیں! "

سعدیہ نے جواب دیا۔

" وہ اسی سلسلہ میں گئی تھی۔ کہ انہیں معلوم ہوا شمینہ باجی یہاں ہیں۔ اور پھر ارشی بھیا کے حادثہ کی خبر پا کر وہ یہاں آ گئیں۔ "

شمینہ اس کی بات سن کر قدرے حیران ہوئی۔

" اس نے ہم سے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔ "

سعدیہ نے ناجیہ کے متعلق کہا۔

اب سوچنا چاہیئے کہ کیا کیا جائے۔

سعدیہ نے قدرے متفکر جیسے انداز میں کہا۔

"سعدیہ ابو جان سے کہہ دو کہ میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ اگر انہیں میری زندگی عزیز ہے تو اپنا یہ خیال چھوڑ دیں۔"

ثمینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ آج تک کوئی بھی بات یا کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کیا گیا تھا۔ تو زندگی کا یہ اہم مسئلہ کیسے وہ اپنی... خواہش کے خلاف کر لینے دیتی۔

اتنے میں ملازمہ نے دوپہر کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع کی۔ لیکن ثمینہ نے انکار کر دیا۔

"تم لوگ چلی جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

ثمینہ نے سعدیہ اور صدف کو مخاطب کیا۔

"یہاں کس کو بھوک ہے؟"

سعدیہ نے جواب دیا۔ ملازمہ ابھی تک کھڑی تھی۔

"انہیں کہہ دو ہم لوگ ذرا ٹھہر کر کھائیں گے۔ ہمارا انتظار نہ کریں۔"

صدف نے ملازمہ سے کہلوا دیا۔ اسے گئے تھوڑی دیر گزری تھی۔ کہ آصفہ بیگم اور نرجس خود آگئیں۔

"کیوں کیا بات ہے لڑکیو؟ تم لوگ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں۔"

انہوں نے ثمینہ کے پلنگ کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ہمیں بھوک نہیں اور ثمینہ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔ اس لئے اس کے پاس بیٹھی ہیں۔"

سعدیہ نے جواب دیا۔

"کیا ہوا میری بیٹی کو؟"

آصفہ بیگم نے ثمینہ کی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں! کچھ حرارت معلوم ہو رہی ہے۔ میں بھائی جان کو بتاتی ہوں۔"

آصفہ بیگم نے جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ان سے کچھ نہ کہئے۔ میں خود ہی اچھی ہو جاؤں گی۔"

ثمینہ نے انہیں منع کر دیا۔

اور آصفہ بیگم چلی گئیں۔

---

(۳۰)

یہ بات سب میں پھیل چکی تھی ۔ کہ راحیل اور ثمینہ کی نسبت عنقریب طے پانے والی ہے ۔ ثمینہ بے چاری بہت تڑپی روئی ۔ لیکن ذوالفقار علی کو نہ جانے کیا ہوا تھا ۔ وہ اس معاملہ میں ثمینہ کی ذات پر اتنا ظلم کیوں کر رہے تھے ۔ حالانکہ عالم جوانی میں وہ بھی ان حالات اور پیار کی کٹھن راہوں سے گذر چکے تھے ۔ لیکن ثمینہ کی کسی بات کا اثر ان کے دل پر نہ ہو سکا ۔ ان کی چھوٹی بہن نے زندگی میں صرف ایک سوال تھا کیا وہ بھی اپنا نہ کرتے جب کہ ان کا خواہر زادہ لاکھوں میں ایک تھا ۔ کیا کمی تھی اس میں کہ وہ آصفہ بیگم کا سوال رد کر دیتے ؟ ۔

اس میں شک نہیں تھا کہ ارشی بھی انہیں بہت پسند تھا ۔ اور اگر وہ پہلے ان سے وہی سوال کرتا ۔ جو ان کی بہن نے کیا تھا ۔ تو وہ ضرور

اسے پورا کرتے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے جذبات کا خیال تو تھا۔ لیکن ان سے بڑھ کر اپنی عزت تھی۔

کئی دن گزر گئے تھے انہوں نے ثمینہ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ یا تو وہ اپنے کمرے میں بند رہتی۔ یا پھر اکیلی دور دور تک سیر کے لئے نکل جاتی۔

گھر میں منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لیکن ثمینہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو صرف ایک ہی خیال کھائے جا رہا تھا۔ کہ وہ ارشی کو کیا جواب دے گی؟

یہ خیال آتے ہی اس کی روح تڑپ اٹھتی اور وہ پہروں اپنے کمرہ میں بند رہتی۔ اصغری بیگم اور نرجس کافی حد تک سب کچھ جان چکی تھیں۔ لیکن خاموش تھیں۔ اس میں ان کا اپنا جو مفاد تھا۔ وہ ارشی کو اپنی نرجس کے لئے پسند کر چکی تھیں۔ وہ خود غرض قسم کی عورت تھیں۔ اس لئے اپنے مفاد کی خاطر کسی کی محبت کا گلا گھونٹنے میں انہیں دریغ نہ تھا۔

راحیل ثمینہ کو روح کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا۔ لیکن ثمینہ کی طرف سے اسے ہمیشہ نفرت سے جواب ملتا۔ اس لمحہ ثمینہ اسے اور بھی پیاری لگتی۔

وہ اس کی باتوں کے جواب میں اپنی مخصوص دلکش اور پرسکون سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر دیتا۔

"مجھے تمہاری یہی ادائیں تو پیاری ہیں ثمینہ!" جتنا ہو سکے

مجھ سے نفرت کرو! مجھے ٹھکرا دو! میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ میں تمہیں پیار کئے جاؤں گا۔ تم میری ہونے والی ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے اور بھی نفرت کرنے لگو گی۔ مجھے تمہاری نفرت ہی چاہیئے۔ میں اسی کے سہارے زندہ رہوں گا۔"

راحیل اکثر اکیلا بیٹھا ہونٹوں میں سگریٹ دبائے گھنٹوں ثمینہ کے تصور سے باتیں کیا کرتا۔

شائد اسے ابھی تک ثمینہ اور راشی کے متعلق کسی زیادہ سنجیدہ بات کا علم نہیں تھا۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ ثمینہ جھیل کنارے بیٹھی تھی۔ کہ کسی کے قدموں کی چاپ سے چونک اٹھی۔ اس کے سامنے راحیل کھڑا تھا۔ ہونٹوں پر وہی دلآویز مسکراہٹ!

"رات ہو گئی کیا اندر نہیں چلو گی ثمینہ! دیکھو سردی بھی بڑھ گئی ہے۔ اور تم نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہن رکھا۔"

راحیل نے بڑی آہستگی اور پیار سے آنکھوں میں اپنی روح کا تمام پیار سمیٹ کر اس سے کہا۔

اس کے یوں قریب کھڑے ہونے پر ثمینہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ راحیل کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی ــــــ

اور راحیل سگار کا لمبا سا کش لیتے ہوئے مسکرا دیا۔

"جاتی ہو ثمینہ! مجھے تمہاری اس نفرت سے بھی لگاؤ ہے۔"
راحیل نے محبت بھری آواز میں کہا۔
"اپنی یہ باتیں ختم کیجیے راحیل بھائی! مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔"
ثمینہ کئی دن سے موقع کی تلاش میں تھی۔ کہ وہ راحیل سے تمام باتیں بتا دے گی۔ اور آج کافی اچھا موقع تھا۔
"زہے نصیب! مجھ سے باتیں کرنی ہیں؟"
راحیل درخت سے کہنی لگا کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔
"جی! بہت کچھ کہنا ہے!
ثمینہ نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ضرور! ضرور!"
راحیل نے برابر مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہاں تو سنیئے! راحیل بھائی! آپ ارشی کو تو جانتے ہیں نا!"
ثمینہ نے بات شروع کی۔
"ہاں! وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"
راحیل نے جواب دیا۔
آپ نے آنے سے قبل میں نے اور ارشی نے آپس میں کچھ وعدے کر رکھے تھے۔ لیکن آپ نے آکر ہمارے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہے بتایئے! آپ کو کیا حق تھا اس ظلم کا؟ ہم دونوں نے آپ کا

کیا بگاڑا ہے؟ ۔۔۔ بولئے! "

ثمینہ روتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

ثمینہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر راحیل حیران سا کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو کیا یہ سب ماموں جان جانتے ہیں؟"

اور اگر انہیں تمہارے اور ارشی کے خیالات کا علم تھا۔ تو انہوں نے یہ ظلم کیوں کیا۔ آہ!!

راحیل نے ایک سرد آہ کھینچی۔

راحیل کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر ثمینہ حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے راحیل سے ہرگز ایسی توقع نہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ مغربی تہذیب کا پروردہ اور آزادانہ ماحول میں سانس لینے والا یہ نوجوان مشرقی تہذیب اور پاکیزہ محبت کے آداب کیا جانتا ہوگا۔ وہ سوچتی تھی رنگینی اور رومانیت پسندی اس کے مزاج میں رچی بسی ہوگی۔ وہ اسے ایک ایسا بھونرا سمجھتی تھی۔ جو باغ میں گوناگوں کھلے پھولوں کا رس چوس کر دوسرے پھولوں کی تلاش میں آوارہ خرامی شروع کر دیتا ہے۔ لیکن راحیل کے خیالات معلوم کر کے اسے اپنے خیالات بدلنا پڑے وہ اسی سوچ اور خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہ راحیل نے اسے ٹوکا۔

"ثمینہ تم کس خیال میں کھو گئیں۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں

ثمینہ راحیل کے ٹوکنے پر اپنے خیالات سے چونکی اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"ہاں! راحیل بھائی! ابو جان سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ... لیکن۔ وہ رونے لگی
ثمینہ اس سے آگے جب کچھ نہ کہہ سکی تو راحیل نے کہا۔
"ثمینہ اپنے آپ کو سنبھالو اور مجھے سب کچھ بتاؤ۔ ماموں جان سب کچھ جانتے
ہوئے تم پر یہ ظلم کیوں کرنے جا رہے ہیں مجھے بتاؤ ثمینہ۔ خدا کے لئے جلدی بتاؤ"
راحیل کے الفاظ نے اسے ڈھارس بندھائی۔ اور آنسوؤں کو آنچل میں
جذب کرتے ہوئے بولی۔
"بات دراصل یہ ہے راحیل بھائی کہ ابو جان پھوپی جان کے سوال کو خالی نہیں
جانے دینا چاہتے اور اپنی آن پر اپنی بیٹی کی خوشی قربان کرنے کو تیار ہیں۔"
ثمینہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اور خاموش ہو گئی۔
"اُف! ثمینہ! تم اتنے دکھ میں مبتلا رہیں اور مجھ سے آج ذکر کیا۔ وہ بھی اگر یہ
اتفاق سے ادھر نہ آجاتا تو آج بھی میں اس بات سے لاعلم رہتا۔"
راحیل ثمینہ کی روحانی تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ اس نے مغربی ماحول میں
ضرور پرورش پائی تھی۔ لیکن اپنے سینے میں ایک حساس اور انتہائی دردمند دل رکھتا
تھا۔ اس کا ضمیر بھی بیدار تھا۔ اس کے اندر خودغرضی مصلحت اور مفاد نام کی
کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک نوجوان اور فیشن زدہ ہونے کے باوجود ایک سادہ دل انسان
تھا۔ اس نے ثمینہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا پھر بھی اسے یہ منظور تھا کہ ساری
زندگی ثمینہ سے جدا رہ کر محبت کی آگ میں جلتا رہے۔ لیکن۔ لیکن ثمینہ کا دکھ اسے
کسی قیمت پر گوارہ نہ تھا۔

"وہ محبت ہی کیا جس کی بنیاد کسی قربانی پر نہ ہو۔ محبت میں جل جل کر مرنا ہی تو
محبت کی معراج ہے۔" راحیل ابھی تک محبت کے اس نکتے فلسفہ میں غرق تھا جو اس
کا اپنا تخلیق کردہ تھا۔

"میں تمہیں دکھی نہ ہونے دوں گا ثمینہ! میں ہر گام تمہاری منشا کے مطابق کروں
گا۔ تم بالکل نہ پریشان ہونا۔" راحیل ثمینہ کو بڑے پیار سے تسلی دے رہا تھا۔

ثمینہ ابھی تک حیرت میں ڈوبی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے ندامت
سی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے کتنی بار راحیل جیسے بلند انسان سے حقارت آمیز سلوک کیا

"آپ کتنے عظیم ہیں راحیل بھائی!"

ثمینہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

"نہیں ثمینہ! اب تم آنسوؤں سے نہیں کھیلو گی۔ مسکراؤ ثمینہ! مسکراؤ۔
مجھے افسوس ہے کہ میری ذات سے تمہیں دکھ پہنچا۔ میں اس کی تلافی کے لئے
وہ سب کچھ کروں گا جو میرے امکان میں ہوگا۔ میں اس ہستی کو تڑپتا ہوا کیسے دیکھ
سکتا ہوں جو مجھے دنیا کی ہر شے سے ہی نہیں بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اگر میں
اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکا تو خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

راحیل نے اندوہ گیں آواز میں کہا۔

ثمینہ اس کے پر عظمت انداز پر خاموش اور متفکر نگاہوں سے اسے دیکھ
رہی تھی۔ راحیل اس وقت کتنا پُر وقار نظر آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا
تھا جیسے اس کے سامنے راحیل نہیں بلکہ کوئی مقدس فرشتہ کھڑا ہو جس کی
عظمت اور تقدس عرش کی بلندیوں کو چھو رہی ہے کتنی بلندی ہے اس کے خیالات

میں کتنی عظمت ہے اس کی پاکیزہ محبت میں، اس کے ارادے کتنے مضبوط ہیں اس کے عزائم کتنے پر شکوہ ہیں۔ وہ زمین کی پستیوں پر آسمان کی بلندیوں کا ایک روشن مینار ہے۔ میری تڑپتی ہوئی حسرتوں اور گھٹتی ہوئی امنگوں کے لئے ایک نئی زندگی بخشنے والا مسیحا!

فرطِ مسرت سے ثمینہ کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں، اس نے ایک بار پھر تشکر آمیز نگاہوں سے راحیل کی طرف دیکھا۔ جو خلا میں نہ جانے کس شے کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں حدِ نظر تک، جا پہنچی تھیں۔ اور نہ معلوم کیا کیا دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن پھر وہ چونکا اور کچھ سوچ کر ثمینہ سے مخاطب ہوا۔

"ارشی کب واپس آرہا ہے؟" راحیل کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"تین، چار روز میں آجائیں گے۔" ثمینہ نے جواب دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ضرور آجائے گا۔" راحیل نے زور دے کر پوچھا۔

"ہاں! مجھے پورا، پورا امید ہے کہ وہ ضرور آجائے گا" ثمینہ نے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

"بس! تو اب تمہیں کوئی تشویش نہ ہونی چاہیئے۔ تم بے فکر رہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔" راحیل نے ثمینہ کو مزید اطمینان دلایا۔

ثمینہ نے ایک بار پھر اسے متشکر نگاہوں سے دیکھا اور اس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔

"اب یہ آنسو کیسے!" راحیل نے ثمینہ کو ٹوکا۔

"کچھ نہیں۔ بس یونہی آپ ہی آپ نکل پڑے میں انہیں روک نہ سکی۔"

ثمینہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"نہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے ثمینہ! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے وعدے سے پھر جاؤں گا۔"

راحیل نے ثمینہ کو ایک بار پھر تسلی دی۔

"نہیں! راحیل بھائی! مجھے آپ پر پورا پورا اطمینان ہے۔ البتہ ان آنسوؤں پر قابو نہیں ہے یہ جب جی چاہتا ہے نکل پڑتے ہیں۔"

"ایک وعدہ کرو گی ثمینہ!" راحیل نے اسے مخاطب کیا۔

"جی!" ثمینہ نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اب تم مغموم نہیں رہو گی۔ میں تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ، اور چہرے پر شگفتگی دیکھنا چاہتا ہوں۔" راحیل نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"جی بہت اچھا! میں کوشش کروں گی۔" ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"کوشش نہیں! پختہ وعدہ کرو۔ میں تمہیں حوصلہ شکن جیسی دیکھنا چاہتا۔ تمہیں عزائم اور مضبوط ارادوں کی مالک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری راہ میں وقت نے جو ایک سنگین دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اسے میں اپنے ارادوں کی قوت سے گرا دوں۔ تمہیں بھی اپنے یاس انگیز خیالات کے ایوان کو مسمار کر دینا چاہیئے۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو ثمینہ!"

راحیل نے اپنے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔

ثمینہ کو راحیل کی پر خلوص اور محبت میں ڈوبی ہوئی باتوں نے پوری طور

پرمطمئن کر دیا۔ وہ اب اپنے آپ کو غم واندوہ کی دنیا سے الگ ایک خوش آئند عالم میں پا رہی تھی اسے اب کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اس کے ذہن و دماغ پر سے غموں کی دبیز تہیں ہٹ چکی تھیں۔ اس کے دل پر جو ہر وقت یاس کے بادل چھائے رہتے تھے یکلخت غائب ہو چکے تھے۔

راحیل کی امید افزا گفتگو نے اس کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس کا چہرہ کامیابی اور مسرت کے ملے جلے جذبے سے دمک اٹھا تھا۔ اس کی روح پر بالیدگی سی چھا رہی تھی۔ راحیل کے لئے اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکل رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"راحیل بھائی! میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گی۔ آپ نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ اب میں کبھی مغموم نہ ہوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

ثمینہ نے پروقار لہجے میں کہا۔

"ہاں! بات بات پر آنسو نکل آنا بزدلی اور کمزوری کی علامت ہے اور ایک مشرقی لڑکی کا اتنا کم ہمت ہونا مشرقی عظمت کی توہین ہے، مشرقی معاشرہ کی ذلت ہے۔"

"اچھا! اب ایک وعدہ اور کرو!" راحیل نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"جی! فرمایئے۔" ثمینہ نے آہستگی سے جواب دیا۔

"یہ باتیں جو میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں۔ کسی تیسرے فرد کو نہیں معلوم ہونی چاہئیں۔ ورنہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا!" راحیل نے اسے بھلا اتنا کیا۔

"بہت بہتر!" ثمینہ نے جواب دیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا لیکن ثمینہ کے دل میں امید کی شمع نے جو روشنی کر رکھی تھی اس سے ہر طرف اجالا ہی اجالا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک خنکی چادر تھی جو فضا کے سینے پر پھیلائی ہوئی تھی۔ اس پر نورانی ستارے یوں ٹکے ہوئے تھے جیسے بیلوں میں کھلے ہوئے پھول ہوں۔ اس طرح ... ہوئی تھی کر راحیل نے اسے مخاطب کیا۔ "ثمینہ! چلو چلیں! اندھیرا گہرا ہو گیا ہے۔"

"چلئے!"

ثمینہ اپنی اس خوابناک اور سرور آگیں دنیا سے واپس آکر بولی۔

راحیل نے سگریٹ سلگانے کے لئے لائٹر جلایا۔ اس کی روشنی میں ثمینہ نے دیکھا راحیل کا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ جیسے اس کی تمناؤں کا تمام خون نچوڑ دیا گیا ہو۔

"کیا دیکھ رہی ہو ثمینہ! یہاں تو صرف ایک کھنڈر ہے!"

راحیل نے ایک طویل آہ کھینچتے ہوئے ثمینہ سے کہا جو اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے ان الفاظ پر متاسف سی ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں دونوں برآمدے کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔

------ ⁘ ------

(۳۱)

ثمینہ حیران تھی کہ ابھی تک راحیل نے اپنے وعدے کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا
کیونکہ ان کی منگنی کی رسم ادا ہونے کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی لیکن راحیل نے ابھی کسی سے
اس کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔

"شائد راحیل نے مجھے دھوکہ دیا ہے!" اسے راحیل پر غصہ آنے لگتا۔
منگنی میں صرف ایک دن باقی تھا۔ ایک ایک لمحہ اس کے لئے پہاڑ تھا۔ وہ
عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ امید و بیم کی حالت میں رات وہ بالکل نہ سو سکی تھی۔ کبھی
اسے راحیل کی باتیں حوصلہ دلاتیں اور کبھی اس کی خاموشی اسے مایوس کر دیتی۔ وہ
سوچنے پر مجبور تھی۔ یہ اس کے مستقبل کا معاملہ تھا۔ اس کی زندگی کا سوال تھا وہ
کیسے مطمئن ہو سکتی تھی۔ جب بھی راحیل اور اس کا سامنا ہوتا راحیل اس کی طرف
دیکھ کر مسکرا دیتا وہ دل ہی دل میں ثمینہ کی بے چینی کے متعلق سوچ کر دکھی ہو جاتا لیکن
اسے وقت کا انتظار تھا۔ وہ وقت سے پہلے تو کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اور ثمینہ!

ثمینہ جب راحیل کو مسکراتا دیکھتی تو اس کے دل پر نا امیدی کی ایک بجلی سی
گر پڑتی شکوک کے گہرے اور دبیز پردے اس کی نگاہوں کے سامنے حائل ہو جاتے

وہ سوچنے لگی۔ کل وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحیل سے منسوب ہو جائیگی۔ زندگی کا تاج محل آن کی آن میں ڈھے جائے گا۔ خوابوں کی منور دنیا تاریکیوں میں بدل جائے گی۔ یہ دنیا ہے ثمینہ! یہاں کوئی کسی کا نہیں! کسی سے وفا کی امید نہیں۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب ایک ہی راستہ ہے جو مجھے ارشی سے دائمی طور پر ملا سکتا ہے۔ لیکن۔ لیکن "کم ہمتی اور بزدلی مشرقی معاشرہ کی تذلیل ہے ثمینہ! ایک مشرقی لڑکی کو باہمت اور مضبوط ارادوں کی مالک ہونا چاہیئے —"

اسے راحیل کے یہ الفاظ یاد آئے اور وہ اپنے اس خیال سے لرز اٹھی۔

ہاں! یہ بزدلی ہے! کچھ بھی ہو وہ ایسا نہیں کرے گی۔ بے شک وہ مشرقی لڑکی ہے اور اپنے کسی عمل سے مشرقی عظمت پر آنچ نہ آنے دیگی اس خیال سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

اس نے دیکھا کوٹھی کو اس تقریب کے لئے خوب آراستہ کیا گیا تھا اسماء، سلیمہ، شباب اور نسیم بیگم، ذوالفقار علی کے چند قریبی دوست اور ان کی بیویاں اور بچے مدعو کئے گئے تھے اس لئے خوب رونق تھی۔ لیکن ثمینہ، اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ وہ عجیب گومگو کے عالم میں تھی۔ اس کا ذہن اسے ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کئے ہوئے تھا جس میں یقین، کامیابی اور امید کی دلکش جھلکیاں بھی تھیں اور بے یقینی اور ناکامی کی تلخیاں بھی! امید اور یقین اس کے سامنے جمیل مناظر پیش کرتیں۔ ارشی! اس کا مرکزِ نگاہ! اس کی محبوب ترین ہستی! اس کا اپنا ہے۔ کوئی اسے اس سے نہیں چھین سکتا۔ اس کے ساتھ اس کی زندگی کتنی

خوشگوار اور سازگار ہوگی۔ قابل رشک، باعث فخر! اور وہ چھپا کی کنول کے ساتھ کھل جاتی پھر اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکراتی۔ "کنول رانی! جھیل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول آپ کو دیکھ کر اور زیادہ کھل اٹھتے ہیں۔ آپ ان کو پسند جو کرتی ہیں۔" منیر اس کی ناگن جیسی چوٹیوں سے کھیل رہا ہوتا تھا اور وہ ہولے سے جواب دیتی۔

"چل ہٹ شریر کہیں کا۔" لیکن اس کی آواز سے اس کی دلی کیفیتوں کا اظہار ہوتا چہرے پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اس کے عارض کی سرخی بے پایاں مسرتوں کا مظہر ہوتی۔ پھر حیا کی آمیزش اس کے سراپا کو ایک عجیب رعنائی بخش دیتی۔ اس موقعہ پر وہ اپنی ان کیفیات کو چھپانے کے لئے اپنے پاؤں جھیل میں لٹکا دیتی اور بے مقصد پانی سے کھیلنے لگتی۔

پھر منظر بدل گیا اور ناکامی اپنے بھیانک و مکروہ روپ میں سامنے آکھڑی ہوگی۔

"ارشی! ارشی اب تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ تو ارشی کو بھول جا۔ اب راحیل ہی تیرا سب کچھ ہے۔ سب کچھ۔"

اور وہ چیخ اٹھی۔ اس کی روح بول اٹھی۔"

"نہیں، نہیں ارشی میرا ہے مجھے اس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ راحیل دھوکے باز نہیں ہے۔ وہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا۔"

"پگلی کہیں کی۔ تو سمجھتی ہے کہ راحیل کے والدین! جنہوں نے صرف تجھے حاصل کرنے کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کیا۔ تجھ سے اتنی آسانی سے دستبردار ہو جائیں گے اور راحیل جس نے تجھے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے اتنی جلدی تجھ سے دست کش ہو جائے گا؟ نادان لڑکی! آج کی دنیا میں انسان کم۔ ہوس پسند اور مطلب پرست زیادہ ملتے

[illegible]
[illegible] آپ کو حالات کے سپرد کر دے۔
ناامیدی نے اسے مشورہ دیا۔
اور وہ حزن و یاس کی ایک ایسی تصویر بن گئی۔ جس میں اپنی زندگی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ جیسے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو۔
اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کا دل اداسیوں کے عمیق غار میں ڈوب رہا تھا۔ اس کا روتے روتے برا حال تھا۔
راحیل جسے اس نے ایک عظیم انسان اور ایک راست باز ہستی سمجھا تھا۔ اب اس پر بھی اسے بھروسہ نہیں رہا۔ اسے باپ کی عزت کا خیال تھا۔ ورنہ وہ جھیل میں کود کر خودکشی کر لیتی۔
اسے ارشی کا انتظار رہتا۔ لیکن یہ خیال کہ وہ اسے کیا منہ دکھائے گی۔ اس کے لئے ایک مسلسل عذاب بن کر رہ گیا تھا۔
" ارشی! تم بھی اگر اپنی کنول کو کسی اور کا ہوتا کیسے دیکھ سکو گے؟ کاش تم نہ آؤ! "
ثمینہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ارشی کے تصور سے مخاطب تھی ۔۔۔ اور کہہ رہی تھی۔
اور آخر وہ دن بھی آ ہی پہنچا۔ جس دن راحیل نے خاندان کی پرانی رسم کے مطابق ثمینہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنانا تھی۔
جس طرح کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ ادھر ثمینہ کو دلہن بنایا

بلب اٹھا۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس وہ کتنی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کی تمام سہیلیاں اس کے گرد جمع تھیں۔

ثمینہ بالکل خاموش تھی۔ روتے روتے اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ اس کے کان تو صرف ارشی کا نام سننے بے تاب تھے۔ شائد اس کی کوئی سہیلی آہستہ سے کہہ دے کہ۔

"تمہارا ارشی آگیا۔"

لیکن ارشی ابھی تک نہ آیا تھا۔

وہ پھر خیالات کی رو میں بہنے لگی۔ کوئی جیسے اس سے کہہ رہا تھا۔

"اب تیرا ارشی نہیں آئے گا۔"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو منہ کا بند توڑ کر پھر بہہ نکلے۔ سیلاب کی مانند۔ دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟" اس نے سر کو جھوڑا لیا۔ اور سسکنے لگی۔

ادھر راحیل ارشی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جیسے جیسے رسم کی ادائیگی کا وقت قریب آرہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ثمینہ کو کیا منہ دکھائے گا۔ اگر ارشی وقت پر نہیں آیا۔ تو پھر کیا ہوگا؟

یہ سوال تھا۔ جو اس کے ذہن سے بار بار اٹھ رہا تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا تھا

تھا۔ وہ بہت سا اور سوچتا رہا۔ بے خیالی میں جلتے ہوئے سگریٹ کا
چرکا اس کی انگلیوں میں لگا اور وہ چونک پڑا۔ سگریٹ اس نے پھینک
دی اور آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"کچھ بھی ہو، ارشی آ کے یا نہ آئے وہ ثمینہ کو واپس نہیں کرے گا وہ
اپنی جگہ ارشی کے لئے خالی کر دے گا۔ وہ چلا جائے گا یہاں سے کہیں دور
بہت دور! جہاں سے اس کا ہلکا سا سایہ بھی ثمینہ پر نہ پڑ سکے گا۔ اور
اپنے اس فیصلے پر وہ اور زیادہ مضبوطی سے جم گیا ایک چٹان کی طرح۔"

ثمینہ کو ہال میں لایا گیا۔ جہاں سب لوگ جمع تھے۔ اور اس کا
انتظار تھا۔ کہ رسم ادا ہو تو دوسرے پروگرام شروع ہوں۔

آصفہ بیگم راحیل کو بلانے اس کے کمرے میں چلی گئیں۔

راحیل کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اسی
کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ ہال کے ساتھ اندر جائے یا کیا کرے۔
کہ اتنے میں کار کے ہارن کی آواز سنائی دی

"شاید ارشی آ گیا!"

راحیل نے سوچا اور جلدی سے باہر کو لپکا۔

ناجیہ اور ارشی کار سے نکل رہے تھے۔ اور یہاں اس قدر
رونق اور سجاوٹ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"

"آؤ! ارشی! میرے بھائی! تم نے بہت دیر لگا دی۔ میری
آنکھیں تو تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہیں۔ شکر ہے کہ تم آ گئے۔

دوستا۔"

راحیل اس کا ہاتھ بڑی گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اور وہ ابھی تک حیران سا کھڑا تھا۔

"مگر یہ سب کیا ہے؟"

ادغی نے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میرا دوست!"

راحیل اس کا ہاتھ تھامے ہال میں داخل ہوا۔

ادغی ہال میں پہنچ کر دور سب کو جمع دیکھ کر چونک پڑا۔ حیرت و استعجاب میں ڈوبا وہ ہال کے چاروں طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ثمینہ کو دلہن بنا دیکھ کر بجھی کی بجھی رہ گئیں۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

"ثمینہ راحیل کو سونپی جا رہی ہے۔"

یہ سب کچھ اسی تقریب کا پیش خیمہ ہے۔ مگر! راحیل میرا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں کر رہا تھا۔"

"شاید اس لئے کہ میری ناکامی پر وہ زیادہ خوش ہو سکے گا۔ اپنی کامیابی پر زیادہ ناز کر سکے گا۔

پھر اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

ثمینہ سامنے مسند پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی تھی۔ اسے ادغی کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے پھر ساون بھادوں

کی بھرپور شرمندہ ہو گئی تھی۔

ناہید اور ارشی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
ناہید حیران اور ارشی اداس تھا۔ ناہید ارشی کی اداسی کا سبب سمجھ رہی تھی۔
راحیل سب کے سامنے ارشی کا ہاتھ تھامے ثمینہ کے قریب آیا۔
ذوالفقار علی، کنزل، وسیم اور آصفہ بیگم ثمینہ کے پاس کھڑے تھے۔
وہ بھی حیرت زدہ سے راحیل کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"ثمینہ اپنا ہاتھ باہر نکالو!"
راحیل کا انداز کچھ ایسا بارعب سا تھا کہ ثمینہ نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ہاتھ آگے بڑھا
اپنی جیب میں پڑی چھوٹی سی مخملیں ڈبیا سے ایک بہت ہی خوبصورت جڑاؤ
انگوٹھی نکال کر اس نے ارشی کے ہاتھ میں تھما دی۔
"ثمینہ کو پہنا دو ارشی! اور میری طرف سے دل سے بانکپا قبول کر دو۔"
ارشی ایک ثانیہ کے لئے راحیل کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ راحیل کو اب تک
وہ جو سمجھ رہا تھا اس سے وہ قطعی مختلف نکلا۔ اس کی نظر میں راحیل کتنا عظیم ہو گیا تھا۔
"یہ کیا کر رہے ہو بیٹے!" کئی آوازیں راحیل کے کانوں سے ٹکرائیں۔
"اپنا فرض ادا کر رہا ہوں امی حضور!" راحیل نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے
فخریہ انداز میں جواب دیا۔
سب لوگ اس بات پر حیران تھے۔
"دیر نہ کرو دوست! سوچنے کی دنیا سے نکل آؤ اور ثمینہ کو انگوٹھی پہنا کر اس رسم
کو ختم کر دو۔" راحیل نے ارشی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ارشی نے لرزتے ہاتھوں سے شینہ کی نازک مخروطی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی۔ شینہ اور ارشی کی نظریں آپس میں ٹکرائیں جیسے دونوں ایک دوسرے کو اپنی محبت کی کامیابی پر مبارک باد دے رہے ہوں۔

"جس فرض کو آپ بزرگوں کو ادا کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے حق دار کا حق اس کو پہنچا دیا۔"

اس کی ان باتوں سے سب ہی متاثر نظر آ رہے تھے۔

"مجھے تم پر فخر ہے میرے بچے تم نے آج انسانیت کا سر اونچا کر دیا ہے۔"

کرنل وسیم نے بڑھ کر راحیل کو گلے سے لگا لیا اور ارشی کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔

ذوالفقار علی بھی راحیل کی اس بات کو فخریہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ آگے بڑھے اور راحیل کا کندھا تھپتھپا کر بولے۔ "راحیل بیٹے! واقعی تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔"

اور انہوں نے شینہ اور ارشی کے سروں پر دست شفقت پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔ انہیں اس وقت شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بچی سے واقعی زیادتی کر رہے تھے اپنے اس لخت جگر سے انصاف نہیں کر رہے تھے جسے انہوں نے باپ ہی نہیں بلکہ ماں بن کر بھی پالا تھا۔ انہیں کیا ہو گیا تھا وہ کیوں ایسا کرنے پہ تلے ہوئے تھے اور اگر ایسا ہو جاتا تو کیا وہ اپنے آپ کو معاف کر سکتے تھے یہ سوچ کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔

لیکن اب! اب! بقول راحیل کے حق حقدار کو ملنا چاہیئے تھا اور مل گیا تھا اور یہ سوچ کر ان کے دماغ پر سے منوں بوجھ اتر گیا۔ جو وہ کئی دنوں سے ذہن پر محسوس کر رہے تھے۔

آصفہ بیگم بیٹے کی اس حرکت پہ خاموش سی ہو گئی تھیں۔

اور شفا ہاشم ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ خوش تھے یہ دیکھ کر۔ انہیں یقین ہی نہیں تھا کہ ان کی محبت کی دنیا میں کبھی اتنی جلدی اجالا ہو جائے گا۔

"تم نے مجھے نئی زندگی بخش دی میرے دوست!" ارشی جو راحیل کے اس اقدام سے بہت ہی متاثر ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑے پیار سے دباتے ہوئے بولا۔"

اس وقت راحیل اسے اپنے سے کتنا بلند کتنا عظیم نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کے بلند کردار پر رشک کرنے لگا۔

ارشی کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی تو راحیل ہونٹوں کے درمیان سگریٹ دبائے اپنے مخصوص پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی اداس آنکھوں کی اداسی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جس کا عکس اس کی دلکش مسکراہٹ پر بھی پڑ رہا تھا اداسی اور سکون کا یہ امتزاج اس کی شخصیت کو ایک انوکھا وقار بخش رہا تھا۔

"راحیل بھائی! آپ واقعی بہت عظیم ہیں۔" ثمینہ جو تھوڑی دیر پہلے راحیل کے خلاف اپنے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا کئے ہوئے تھی اس کے متعلق سوچ رہی تھی اس کے سامنے اس کا محسن بھی تھا اور اس کا محبوب بھی۔ وہ دونوں کو فخر سے دیکھ کر اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی ——— !

فرزانہ نظیر دارثی انارکلی